

اشاعت کا ۹۶ واں سال
زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کا ترجمان

نیکو اور



۱۵ روپے جون ۲۰۱۸ء



اقبال مجید آصف زمانی انیس رفیع نصرت ظہیر
احمد ابراہیم علوی شہپر رسول سلمان علی خان خورشید حیات
پرویز شہریار راج موہن جھا کیتو و شو ناتھ ریڈی فضل الرحمن اصلاحی



محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش



اردو کے مایہ ناز ادیبوں کی تاریخ پیدائش (جون)



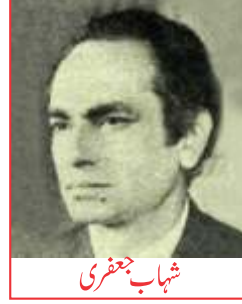
گوپال متل



سیما ب اکبر آبادی



شبلی نعمانی



شہاب جعفری



وہاب اشرفی



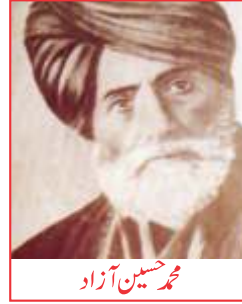
نثار اللیث صدیقی



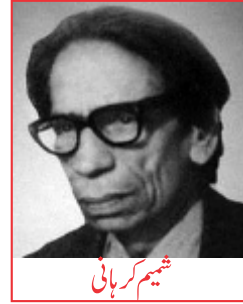
مفتی تبسم



وارث علوی



محمد حسین آزاد



شیمم کربانی



نثار احمد فاروقی



مجید احمد



کنہیا لال کپور



سلٹی صدیقی



شہریار

۱۹۹۱	۲۳ اپریل	عزیز حامد منی
۱۹۲۴	۱۵ جون	اظہار اثر
۲۰۱۱	۱۵ اپریل	شہریار
۲۰۱۳	۱۳ فروری	قیصر حیدر دہلوی
۱۹۹۲	۹ فروری	سلٹی صدیقی
۲۰۱۳	۱۳ فروری	کنہیا لال کپور
۱۹۸۰	۱۸ مئی	مجید احمد
۱۹۷۴	۱۱ مئی	نثار احمد فاروقی

۱۹۱۰	۲۲ جنوری	محمد حسین آزاد
۱۸۳۰	۱۰ جون	عبدالرحمن بجنوری
۱۹۱۸	۷ نومبر	ابن انشاء
۱۹۷۸	۱۱ جنوری	وارث علوی
۲۰۱۳	۹ جنوری	نازش انصاری
۲۰۰۳	۱۲ جون	مفتی تبسم
۲۰۱۲	۱۵ فروری	احمد رضا خاں بریلوی
۱۹۲۱	۲۸ اکتوبر	شاہ عالم ثانی
۱۸۰۶	۱۹ نومبر	ابواللیث صدیقی

۱۹۸۷	۲۸ ستمبر	احمد جمال پاشا
۱۹۳۶	۶ جون	وہاب اشرفی
۲۰۱۲	۱۵ جولائی	شہاب جعفری
۱۹۳۰	۲ جون	شبلی نعمانی
۱۹۰۲	۲۷ جنوری	پنڈت دن ناتھ شرشار
۱۹۵۱	۳۱ جنوری	سیما ب اکبر آبادی
۱۹۹۳	۱۵ اپریل	گوپال متل
۱۹۸۷	۳۱ مئی	خواجہ احمد عباس
۱۹۷۵	۱۹ مارچ	شیمم کربانی

نیا دور

لکھنؤ

جون ۲۰۱۸ء

پبلشر: ڈاکٹر اجول کمار

ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر
سہیل وحید

فون: 9415007694

Ph. No. 2239132 Ext. 228

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن و زرسالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

ترجمین کار: وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پبلیشرز، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

زرسالانہ: ۱۶۵/۱۶ روپے

ترسیل زرکاپتہ

ڈائریکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour
of Director, Information & Public Relations
Department, UP, Lucknow

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیادور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیادور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

آصفہ زمانی

غزل
صفحہ ۱۸

اقبال مجید

اپنے اپنے طوطے
صفحہ ۱۹

انتون چیخوف

اذیت
صفحہ ۵۲

مرزا جعفر حسین

تعلیم و تربیت اطفال
صفحہ ۴۳

خورشید حیات

سورج آجی
جاگ رہا ہے
صفحہ ۲۹

انیس رفیع

ایک اور برزخی
صفحہ ۲۶

سلمان علی خاں

نیادور کے پیشرو
اخبار و جرائد
صفحہ ۷

شہپر رسول

غزل
صفحہ ۱۸

احمد ابراہیم علوی

'ہماری آواز سے'
'نیادور' تک کا سفر
صفحہ ۳

فضل الرحمن اصلاحی

ملک زادہ منظور احمد
بجٹیت ادارہ نگار
صفحہ ۱۶

راج موہن جھما

ہمدردی
صفحہ ۵۵

کیتو شونا تھریڈی

پنچہ خانہ
صفحہ ۴۶

نصرت ظہیر

پہلا روزہ اور رمضان
کی کچھ یادیں
صفحہ ۵۸

پرویز شہریار

بچپن کا ایک خواب
صفحہ ۳۵

نیادور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا تعلق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

نیادور کی تاریخ

تاریخ اپنے آپ میں نہایت وسیع عمل کا جواز رکھتی ہے۔ ازل سے ابد تک یہ عمل ہزاروں لاکھوں سال سے جاری و ساری ہے۔ یہ سلسلہ رفتی دنیا تک قائم رہے گا۔ جب تک انسان ہے اس کی تاریخ رقم ہوتی رہے گی۔ تاریخ کے معاملات بچیدہ بچیدہ لیکن پرکشش بھی ہوتے ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی انسان کے فطریہ اور ذہن کی نشوونما کرتی ہے۔

تاریخ Precedence اور Contidions کو ملا کر Present کا نام ہے۔ جو گزر چکا ہے وہ حال کے لئے کیا معنی رکھتا ہے اور ماضی سے ہم نے کیا سبق لیا کہ مستقبل تائناک رہے۔ بظاہر تاریخ کا مطالعہ بھی درس دیتا ہے لیکن در حقیقت تاریخ ہمارے اجداد کی حاصل شدہ ورثہ کو تجدید نو کی تحریک بھی دیتی ہے۔ ہم نے نیادور کی ادارت سنبھالنے کے بعد اس رسالے کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھا اور ان تمام لوگوں سے اس بارے میں گفتگو کی جو نیادور سے وابستہ رہے ہیں۔ کچھ کتابوں سے بھی استفادہ کیا اور نیادور کے ان تمام شماروں کی ورق گردانی بھی کی جو دستیاب ہیں۔ ہماری امیدوں کے برخلاف نیادور کی تاریخ مرتب کرنے کی بھی کوشش نہیں کی گئی۔ چیدہ چیدہ مضامین جو نیادور کے نصف صدی نمبر میں شائع ہوئے یا کبھی دوسرے موقعوں پر لکھے گئے، انہیں سے ہم نے نتیجہ اخذ کیا کہ نیادور کی تاریخ کم و بیش تقریباً پچانوے سال پر محیط ہے۔ اسی لئے ہم نے نیادور کے سرورق پر اس کی سن تاریخ تحریر کرنے کو بھی ضروری سمجھا۔

آج نیادور جس صورتی اور معنوی حسن سے مزین ہے یہ انہیں تجربات کا اعلامیہ ہے۔ چونکہ اس کی بنیاد میں مشاہیر دانشوروں اور قلم کاروں کی عرق ریزی کا بہت بڑا عمل دخل رہا ہے۔ یہ وہ میراث ہے جس کی ذمہ داری اپنے سر لینا اپنے آپ میں ایک بہت بڑا کمٹمنٹ ہے۔ بات وہاں سے نکلتی ہے جب ریاست اتر پردیش بھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ ان دنوں حکومت کی باگ ڈور آگرہ سے سنبھالی جاتی تھی۔ فرنگیوں کے مزاج میں مکالمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، بظاہر خاموش طبع فرنگی اپنی بات کہنے کے لئے کوئی نہ کوئی وسیلہ تلاش کرنے کے ماہر ہوتے ہیں اور یہ عمل آج بھی جاری ہے کہ روز بروز ترسیل کے نئی نئی تکنیک کبھی واٹس اپ اور کبھی دوسری شکلوں میں سامنے آ رہی ہے۔

بات آگرہ پریسی ڈنسی سے شروع ہوئی تھی تو قابل ذکر یہ ہے کہ آگرہ اخبار کیونکر وجود میں آیا اور کتنے دن قائم رہا۔ اس کے نشانات باقیات کے طور پر بھی موجود نہیں ہیں۔

نیادور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی
نیادور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کئے جا رہے ہیں۔

لیکن صحافت پر مبنی مختلف کتابوں میں آگرہ اخبار کا ذکر بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی وہ پہلا رسالہ جو اخبار کی شکل میں تھا جسے انگریز حکمران نے ۱۹۲۲ء میں شروع کیا تھا۔ ہندوستانی عوام نے زمام حکومت انگریزوں کے ہاتھوں سے چھین کر خود سنبھالی لی، لیکن سرکاری نظام کی تمام ضروریات اپنے وجود کو قائم رکھتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی گئیں اور الگ الگ شکلیں بھی اختیار کرنی گئیں۔ موجودہ سرکاری سٹم کا اگر انگریزوں کے زمانے کے دفتری نظام سے موازنہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ آگرہ اخبار کے بعد ہماری آواز پھر اطلاعات سے اتر پردیش ہوتے ہوئے نیادور کی تشکیل کا عمل بھی اسی تاریخی وراثت کا جزو لا ینفک ہے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے درمیان ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے نیادور سے قبل محکمہ اطلاعات اور اتر پردیش حکومت کے ذریعہ شائع ہونے والے ان رسالوں کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ انہیں ایک اہم دستاویز کی طرح محفوظ بھی کر رکھا ہے۔ جناب سلمان علی خاں چونکہ زمانہ دراز تک محکمہ اطلاعات سے وابستہ رہے ہیں اور اردو صحافت کی تاریخ پر ان کی خاصی نگاہ بھی ہے، انہوں نے ہماری گزارش کو تسلیم کرتے ہوئے نیادور اور اس کے ہم

جون ۲۰۱۸ء سے نیادور کی قیمت

۱۵ روپے فی شمارہ کے جزوی اضافے کے ساتھ

زیرو سالانہ ۱۶۵ روپے معین کیا گیا ہے

عصر اخبار و رسائل کے مختصر تعارف اور تاریخ پر سیر حاصل مضمون لکھا۔

اردو روزنامہ 'آگ' کے ایڈیٹر اور مشہور صحافی جناب احمد ابراہیم علوی صاحب کے بھی ہم بچیدہ مضمون ہیں کہ انہوں نے نیادور سے متعلق اپنی تمام معلومات کو ایک مضمون کی شکل دیتے ہوئے نیادور سے پیشتر نکلنے والے رسائل کی نشاندہی کی۔ ان کے پاس ہماری زبان کے کئی شمارے خستہ حالت

میں موجود ہیں۔ نیادور سے ان کے تعلق اور اردو صحافت کو اوڑھنا بچھونا بنا چکے علوی صاحب اس قسم کے بیش بہا صحافتی سرمایہ محفوظ کئے ہوئے ہیں۔

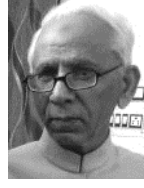
ہندوستانی ادب میں لیجنڈ کی حیثیت رکھنے والے اردو طنز و مزاح کے شہنشاہ مجتبیٰ حسین پر نیادور جلد ہی ایک شمارہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کا اعلان بھی ہم مئی ۲۰۱۸ء کے شمارے میں کر چکے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی طرح ادب کی شخصیت اور تہہ دار تحریروں پر مضامین درکار ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ نیادور اپنے تمام سابقہ شماروں کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے مجتبیٰ حسین نمبر بھی شائع کرے گا۔ ہم نے ساتی فاروقی اور فضیل جعفری پر بھی ایک پورا شمارہ مرکوز کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ان شماروں کے لئے بھی مضامین کی درخواست ہے لیکن مضامین گھٹے بڑے انداز میں روایتی پیٹرن پر ہونے کے بجائے جدید دور کے تقاضوں سے مناسبت ضرور رکھتے ہوں۔

جون ۲۰۱۸ء سے نیادور کی قیمت ۱۰ روپے کے بجائے پندرہ روپے فی شمارہ کی جارہی ہے۔ اس اعتبار سے زری سالانہ ۱۶۵ روپے طے کیا گیا ہے۔ کاغذ، چھپائی، کوئیر، ڈاک اور دیگر اخراجات میں گزشتہ برسوں میں بے تحاشا اضافہ ہوا لیکن نیادور کی قیمت میں نہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ قارئین نیادور اس معمولی سے اضافہ کو باخاطر نہیں محسوس کریں گے۔ جن قارئین کا زری سالانہ جمع ہے، ان کی مدت اضافہ شدہ قیمت کے اعتبار سے شمارہ کی گئی نیز ایجنسیوں کے کمیشن میں کسی طرح کا ردوبدل نہیں کیا گیا ہے۔ اس مرتبہ تبصرے والے کالم میں اہم تخصیص کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں موصول ہونے والی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے لہذا ایسی صورت میں تمام کتابوں پر تبصرہ کروانا انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لئے اس بار ادارہ نیادور دستیاب ہونے والی کتابوں میں سے شعری مجموعوں کا انتخاب کر کے اس پر تبصرہ شائع کر رہا ہے۔

نیادور کے سرورق کے اندرونی حصہ پر مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ ولادت و وفات سے متعلق شائع ہونے والا جدول قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کلینڈر سے ماخوذ ہے لہذا تاریخی اغلاط کے لئے نیادور کسی طرح کا ذمہ دار نہیں ہے۔ قارئین نیادور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا مئی ۲۰۱۸ء

www.information.up.nic.in

پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔



احمد ابراہیم علوی

ایڈیٹرز نامہ آگ، ڈالی باغ لکھنؤ

رابطہ: 0522-2204567

ہماری آواز 'اطلاعات' بنا اور پھر نیا دور ہو گیا

اغراض سے ان لوگوں کے ذریعہ نکالے جاتے ہیں جن کا علم و ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، اس سلسلے میں ڈاکٹر ابوالیث صدیقی کا ایک اقتباس بڑا مفید اور دلچسپ ہے۔

'اردو اخباروں اور رسالوں کے موجودہ مذاق کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان، اس کے ادب، شاعری، تنقید اور اسالیب کی نشوونما اور فروغ میں سب سے زیادہ حصہ اخباروں اور رسالوں کا ہے۔ اول تو کتابیں ہمارے یہاں لکھی ہی کم جاتی ہیں۔ شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد اور بھی کم ہوتی ہے پھر ان کتابوں کے پڑھنے والے اور بھی کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر سال جتنے مضامین لکھے جاتے ہیں اور اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں ان کی اور ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں ہر طرح کے اخبار اور رسالے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں صرف کاغذی چیتھڑے کہنا چاہئے اور بقول ہمارے ایک دوست کے، کتب خانوں اور الماریوں میں محفوظ کرنا تو درکنار، اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ غسل خانے کی زینت بن سکیں۔ ان میں بعض صرف نعروں پر زندہ ہیں اور بعض پرانی قبروں کے مجاور ہیں۔ بعض گفتہ اور ناگفتہ مردانہ اور زنانہ جنسی بیماریوں کے علاج اور قوت مردی کی دواؤں کے اشتہارات کی برکت سے زندہ ہیں۔ ان اشتہاروں کو پڑھ کر بہتوں کا بھلا ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو لیکن ان کے

زبان و ادب کی آبیاری کی ہے۔ انہیں لکھنے پڑھنے، چھپنے اور قارئین تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے وہ وسائل کبھی حاصل نہیں رہے جو کہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ادیبوں کو حاصل رہتے ہیں۔ اچھی اچھی کتابوں اور اخبارات و رسائل تک کو اتنی بڑی تعداد میں قارئین نہیں مل پاتے ہیں کہ کتب و اخبارات کی



فروخت سے تمام ضرورتیں محسن و خوبی پوری ہو سکیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر لکھنؤ کے ماہنامہ 'نیادور' کی اشاعت کے ۲۷ سال پورے ہونے پر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔

اردو کے اخبارات اور رسائل کیوں مقبول نہیں ہو پاتے، وہ کیوں نہیں دراز عمر پاتے، اس کے متعدد اسباب ہیں۔ ان میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ زیادہ تر اخبارات اور رسائل وقتی ضرورتوں یا پھر کاروباری

حقیقت یہ ہے کہ حالات اتنے خراب نہیں ہیں جتنے بتائے جا رہے ہیں۔ اسی لئے جو کچھ نہیں کرنا چاہتے ہیں وہ دوسروں کو بھی کچھ نہ کرنے دینا چاہتے ہیں تاکہ انہیں کوئی برائہ کہہ سکے پھر بھی جو کچھ کرنے کا عزم رکھتے ہیں وہ اپنی کوششیں جاری رکھتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔

حالات بدلنے رہتے ہیں۔ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے۔ ایسے میں خود کو حالات سے نبرد آزما ہونے کا موقع ملتا ہے تب غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں سے گریز کرتے ہوئے اپنے عزم کے مطابق سب کچھ کرنے کا جذبہ تقویت حاصل کرتا ہے۔

پرانے طور طریقے چھوڑ کر نئے حالات کے مطابق اگر صحافت سے مستفید ہونے کی کوشش ہو تو کامیابی یقینی ہوگی۔ جدید تقاضوں اور کاروبار کے اصول و ضوابط کو پیش نظر رکھ کر کوئی اخبار نکالا جائے یا رسالہ شروع کیا جائے تو یقیناً کامیابی ہوگی۔ اچھے مقاصد سبھی طرح کے قارئین کی پسند اور ناپسند، بازار کی ضرورت مگر اپنے نظریات کو بہر حال عزیز رکھتے ہوئے جو بھی رسائل نکالے جائیں گے وہ یقیناً عوام میں مقبولیت حاصل کریں گے اور تجارتی اعتبار سے بھی فائدہ پہنچائیں گے۔ بس کوشش شرط ہے۔

اردو زبان کی تاریخ میں خوشحالی کا کوئی ایسا دور اب تک نہیں آیا جس میں مصنفین اور صحافیوں کو آسودگی میسر رہی ہو۔ اردو کے مصنفین نے ہمیشہ خون جگر سے

شائع کرنے والوں کا بھلا ضرور ہوتا ہے۔ کچھ رسالے ارباب سیاست، ارکان سیاست اور سیاسی قیاموں کی سرپرستی سے زندہ ہیں۔ انہیں سرکاری اشتہارات ملتے ہیں۔ ان کے پرچوں کی ایک بڑی تعداد مفت تقسیم کرنے اور ردی میں بیچنے کے لئے خریدی جاتی ہے۔

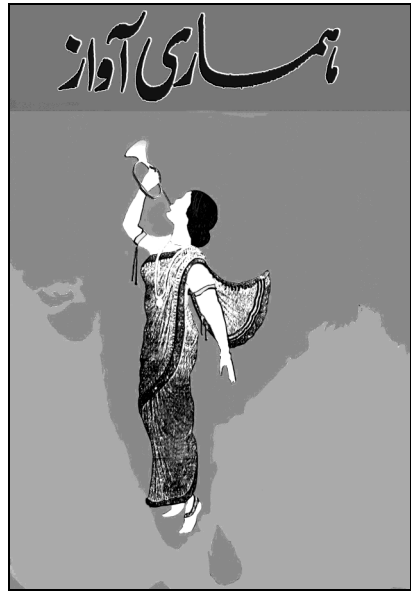
(ماہنامہ نگار، نیاز نمبر دوم ۱۹۶۳ء، پاکستان مضمون، نیاز اور نگار)

اردو میں اخبارات اور رسائل کے نکلنے اور بند ہونے کی روایت بڑی پرانی ہے۔ اسی لئے جب کوئی اچھا اخبار یا رسالہ نکلتا ہے تو لوگ بجائے خوش ہونے کے غمگین ہوتے ہیں کہ یہ اپنے محدود وسائل کے سبب زیادہ نہ چل سکے گا۔ ہوتا بھی یہی ہے۔ ’تہذیب الاخلاق‘، ’مخزن‘، ’ریاست‘، ’نگار‘، ’ہمایوں‘، ’ندیم‘، ’زمانہ‘ اور ’آئینہ‘ جیسے ہر اعتبار سے معیاری اور قابل قدر اخبارات و رسائل بھی زیادہ زندگی نہ پاسکے۔

’تہذیب الاخلاق‘ وہ رسالہ تھا جس نے اردو زبان میں ہر طرح کے مضامین اور مباحث کی بنا ڈالی۔ سرسید احمد خاں نے اس رسالے کے ذریعہ اردو زبان کو وسعت خیال و اظہار عطا کی اور آج جو ہم ہر موضوع پر طرح طرح کے مضامین اردو میں پڑھتے ہیں وہ اسی کے رہین منت ہیں۔

’مخزن‘ شیخ عبدالقادر کا وہ معیاری رسالہ تھا جس کے ذریعہ انہوں نے نہ صرف جلیل القدر شخصیتوں کے خیال و افکار کو شائع کیا بلکہ شخصیتوں کو بنایا، نکھارا اور بام عروج پر پہنچایا۔ ’ہمایوں‘ معیاری ادب پیش کرنے والے رسائل کا سرخیل کارواں رہا ہے، ’ریاست‘ کو پابندی وقت سے نکالنے اور معیاری و معتبر بنانے رکھنے کے لئے کہنا چاہئے۔ سردار دیوان سنگھ مفتون نے اپنی ریاست ہی ختم کر دی۔ ’نگار‘ اپنی علمی و ادبی دھونس کے باوجود نیا رتھچوری کو ترک وطن سے باز نہ رکھ سکا، ’زمانہ‘ کوٹشی دیان رائے نغم اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے عہد کے تمام قابل قدر ادیبوں،

شاعروں اور صحافیوں کی خدمت حاصل کرنے کے باوجود لمبی عمر نہ دلا سکے۔ ’آئینہ‘ کو ماہنامہ ’شعب‘ کے



مالکان کی تمام صلاحیتیں، رسائل اور تجربے بھی زندہ رہنے کی صلاحیت نہ عطا کر سکے۔ علی گڑھ سے پندرہ روزہ ’خیر و خیر‘ کو انگریزی صحافت کے معیار کے مطابق

نمبر	کرم سٹا	تقریر	تقریر
۱	۱	۱	۱
۲	۲	۲	۲
۳	۳	۳	۳
۴	۴	۴	۴
۵	۵	۵	۵
۶	۶	۶	۶
۷	۷	۷	۷
۸	۸	۸	۸
۹	۹	۹	۹
۱۰	۱۰	۱۰	۱۰
۱۱	۱۱	۱۱	۱۱
۱۲	۱۲	۱۲	۱۲
۱۳	۱۳	۱۳	۱۳
۱۴	۱۴	۱۴	۱۴
۱۵	۱۵	۱۵	۱۵
۱۶	۱۶	۱۶	۱۶
۱۷	۱۷	۱۷	۱۷
۱۸	۱۸	۱۸	۱۸
۱۹	۱۹	۱۹	۱۹
۲۰	۲۰	۲۰	۲۰
۲۱	۲۱	۲۱	۲۱
۲۲	۲۲	۲۲	۲۲
۲۳	۲۳	۲۳	۲۳
۲۴	۲۴	۲۴	۲۴
۲۵	۲۵	۲۵	۲۵
۲۶	۲۶	۲۶	۲۶
۲۷	۲۷	۲۷	۲۷
۲۸	۲۸	۲۸	۲۸
۲۹	۲۹	۲۹	۲۹
۳۰	۳۰	۳۰	۳۰
۳۱	۳۱	۳۱	۳۱
۳۲	۳۲	۳۲	۳۲
۳۳	۳۳	۳۳	۳۳
۳۴	۳۴	۳۴	۳۴
۳۵	۳۵	۳۵	۳۵
۳۶	۳۶	۳۶	۳۶
۳۷	۳۷	۳۷	۳۷
۳۸	۳۸	۳۸	۳۸
۳۹	۳۹	۳۹	۳۹
۴۰	۴۰	۴۰	۴۰
۴۱	۴۱	۴۱	۴۱
۴۲	۴۲	۴۲	۴۲
۴۳	۴۳	۴۳	۴۳
۴۴	۴۴	۴۴	۴۴
۴۵	۴۵	۴۵	۴۵
۴۶	۴۶	۴۶	۴۶
۴۷	۴۷	۴۷	۴۷
۴۸	۴۸	۴۸	۴۸
۴۹	۴۹	۴۹	۴۹
۵۰	۵۰	۵۰	۵۰

نکالا گیا۔ اس کو ایک بڑے گھرانے کی سرپرستی حاصل ہوئی اور اس رسالے نے جرائم نمبر، کینسر نمبر، دیوبند نمبر، کرکٹ نمبر، ایکشن نمبر جیسے خاص نمبر شائع کئے اور بڑا

نام پیدا کیا پھر بھی یہ تین سال سے زیادہ کی زندگی حاصل نہ کر سکا۔

گیا (بہار) سے نکلنے والا ’ندیم‘ بہار کا بڑا ہی معیاری رسالہ تھا۔ اس میں جلیل القدر ادیب اور شاعر نمودار ہوتے تھے۔ بڑی اہم بحثیں اس کے صفحات میں بکھری پڑی ہیں لیکن یہ بھی طویل عمر نہ پاسکا۔ حیدرآباد دکن میں سلیمان اریب کی ادارت میں نکلنے والے ’صبا‘ نے بھی بڑا وقار حاصل کیا اور اس میں شائع ہو جانا بڑے بڑے ادیبوں کا کمال فن سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے سبب سلیمان اریب کی تنگ دستی بڑھتی رہی اور بالآخر انہوں نے دم توڑ دیا اور رسالہ بھی بند ہو گیا۔

بنگلور سے ماہنامہ ’نیادور‘ محمود ایاز اور ممتاز شیریں کی ادارت میں بڑی آب و تاب سے نکلا اور ہند و پاک کے انتہائی معیاری رسائل میں شمار ہوا لیکن جلد ہی دم توڑ گیا۔

لکھنؤ کا ماہنامہ ’نیادور‘ اپنی زندگی کے ۷۲ سال بیخبر و خوبی تمام کر کے مزید تب و تاب اور جاہ و جلال سے نکل رہا ہے تو اس پر خوشی سے زیادہ حیرت ہو رہی ہے۔ اگر ان لوگوں کی مساعی جملہ کو بہ نظر حسین نہ دیکھا جائے تو صرف جیانا انصافی ہوگی جنہوں نے شروع ہی سے نیادور کو حکومت وقت کا ڈھنڈور پچی بنانے کے بجائے زیادہ سے زیادہ علمی و ادبی اور معلوماتی باوقار رسالہ بنانے کی کوشش کی تو اس سلسلہ میں حکومت اتر پردیش اور اس کے محکمہ اطلاعات کو بھی داد دینا ضروری ہوگا جس نے کبھی نیادور کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت نہیں کی بلکہ اس کو بڑی خوشی سے ایک آزاد خیال معیاری ادبی رسالہ بننے دیکھ کر اظہار مسرت ہی کیا۔ محکمہ اطلاعات کے وہ افسران بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے نیادور کی ادبی اور علمی معیار کو قائم رکھنے میں شاید کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔

یہ بات اس لئے مزید قابل تعریف ہے کہ

ہندوستان کی ہر ریاست سے ایک سرکاری اردو اخبار یا رسالہ ضرور نکلتا ہے جیسے دہلی سے 'دلی'، آندھرا پردیش سے 'آندھرا پردیش'، بہار سے 'بہار کی خبریں'، کشمیر سے 'شیرازہ'، پنجاب سے 'پاساں' وغیرہ لیکن ان میں اس کسی کی وہ ادبی حیثیت نہیں جو حکومت اتر پردیش کے اردو ماہنامہ 'نیادور' کی ہے جب کہ سب کو کم و بیش وہی سہولیات حاصل ہیں جو کہ نیادور کو حاصل رہی ہیں۔

قابل ذکر امر یہ بھی ہے کہ نیادور اپنے موجودہ نام اور ہیئت کے ساتھ ۷۲ سال پورے کر چکا ہے، لیکن یہ رسالہ اس سے پہلے 'اتر پردیش'، 'اطلاعات' اور 'ہماری آواز' کے نام سے بھی نکلتا رہا ہے۔

آزادی وطن سے پہلے جب برطانوی حکومت تھی اور اتر پردیش صوبہ متحدہ ہوا کرتا تھا اس کا سیاسی دارالسلطنت الہ آباد تھا۔ اس وقت انگریزی حکومت نے اپنے کارناموں کی تشہیر و اشاعت کے لئے اور جنگ کے لئے زیادہ سے زیادہ ہندوستانی جوانوں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے 'ہماری آواز' کے نام سے اردو ہفتہ وار نکالا تھا جو کہ سنٹری آف وار کا ترجمان تھا۔ یہ غالباً ۱۹۴۲ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ آج کے عام رسالوں کے سائز کا ہوتا تھا۔ اس کا سرورق آرٹ پیپر پر ہوتا تھا اور اس پر ہندوستان کا نقشہ بنا ہوتا تھا۔ بالکل درمیان میں ساڑھی میں ملبوس ایک عورت بگل بجاتی ہوئی ہوتی تھی۔ ڈزائن یہی رہتا تھا مگر رنگ بدلتا رہتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر جناب مشیر احمد علوی ناظر کا کوروی تھے۔ پہلے سنسلیق کتابت ہوتی تھی پھر ٹائپ کمپوزنگ سے شائع ہونے لگا۔ اس میں دنیا کے ان تمام ملک کی خبریں اختصار سے دی جاتی تھیں جہاں جہاں اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ جاپان کے خلاف بہت کچھ چھپتا تھا۔ عموماً ایک چوہا بنایا جاتا تھا اور نعرہ ہوتا تھا 'تیرا میرا دشمن جانی یہ چوہا جاپانی'، سرورق کے صفحات تصاویر سے مزین ہوتے تھے۔ اکثر آخری صفحے پر کتب و رسائل پر تبصرہ

بھی ہوتا تھا۔ ایسی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں جن کے ذریعہ قارئین کو جنگ میں شامل ہونے کے لئے اکسایا جاتا تھا۔ یکم جنوری ۱۹۴۵ء کو اخبار میں صفحہ ۲ پر فراق گورکھپوری کی کتاب 'اندازے' پر تبصرہ ہے جو ناظر کا کوروی نے کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے 'اردو زبان کو فراق پر ناز کرنا چاہئے'۔

آزادی کے بعد جب ملک میں اپنی حکومت قائم ہوئی اور اتر پردیش کا وجود عمل میں آیا۔ لکھنؤ پھر دارالسلطنت بنا تب ریاستی حکومت کو اپنے کاموں سے عوام کو واقف رکھنے کے لئے کسی ذریعہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ محکمہ اطلاعات حکومت کے کاموں سے



عوام کو خبروں کے لیٹن سے واقف کرنا رہتا تھا۔ اردو دارالعوام کی دلچسپی کی خبریں ترجمہ کر کے اردو اخباروں کو برائے اشاعت بھیجی جاتی تھیں۔ پھر ان کو باقاعدہ یکجا کر کے چھپوا کر تقسیم کیا جانے لگا۔ اس کام کے لئے کئی افسر اطلاعات تھے۔ انہیں میں اردو دارالعوام جناب علی جواد زیدی تھے۔ جناب زیدی نے ازراہ ذرہ نوازی مجھے خود بتایا کہ نیوز لیٹن کو باقاعدہ رسالہ بنانے کا خیال انہیں کی تجویز تھی۔ انہوں نے اس لیٹن کو دلچسپ اور قابل مطالعہ بنانے کے لئے اپنے دوستوں سے ان کی نظمیں غزلیں لے کر شائع کرنا شروع کر دیں۔ یہ

کاوش پسند کی گئی تو انہوں نے مضامین کا بھی سلسلہ شروع کر دیا۔ اس طرح ایک نیوز لیٹن ایک باقاعدہ رسالہ بن گیا۔ یہ عرصہ تک 'اطلاعات' کے نام سے نکلتا رہا۔ چونکہ اس نام کے رسالے میں اطلاعات کے علاوہ کچھ گنجائش نہ تھی اس لئے ان کا نام 'اتر پردیش' رکھا گیا اور خبروں کے علاوہ کچھ اور کی گنجائش نکالی گئی۔ اس زمانے میں بعض بڑے مفید اور اہم مضامین شائع ہوتے تھے۔

جناب علی جواد زیدی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اسی اثنا میں بنگلور سے محمود ایاز کی ادارت میں نکلنے والا 'نیادور' بند ہو گیا تو انہوں نے حکومت اتر پردیش اور خصوصاً وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سپورنا نند کو یہ تجویز پیش کی کہ 'اطلاعات' کا نام 'نیادور' کر دیا جائے تو اس کی اہمیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر سپورنا نند نے یہ تجویز منظور کر لی اور تب ہی سے 'نیادور' باقاعدہ ادبی رسالہ بن کر نکلنے لگا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر جناب علی جواد زیدی ہوئے۔ جب وہ ترقی کر کے دہلی چلے گئے تو جناب فرحت اللہ انصاری نے کچھ عرصہ تک یہ ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس کے بعد جناب صباح الدین عمر ایڈیٹر ہوئے۔ انہوں نے اس کو ایک ٹھوس ادبی رسالے کی حیثیت دی۔ ملک کے تمام ممتاز اور مقبول ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل کیا۔ اس سے یہ رسالہ بڑا اہم ادبی مجلہ بن گیا اور اس میں شائع ہونا کسی بھی ادیب یا شاعر کے لئے باعث افتخار سمجھا جانے لگا۔ صباح الدین عمر صاحب نے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے سخت اصولوں کو اپنایا اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑے بڑے ادیبوں تک کو کوئی چھوٹ نہ دی۔ انہوں نے کتابت، طباعت، معیار، مواد سب پر ہمیشہ نظر رکھی۔ جناب صباح الدین عمر صاحب کے ترقی پا جانے کے بعد جناب خورشید احمد نے 'نیادور' کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ان کے بعد

جناب امیر احمد صدیقی ایڈیٹر ہوئے۔ ان کے سبکدوش ہونے کے بعد جناب شاہ نواز قریشی کارگزار ایڈیٹر ہوئے اور ان کے بعد جناب سید امجد حسین ایڈیٹر ہوئے پھر جناب وضاحت حسین رضوی ایڈیٹر ہوئے جنہوں نے خاص نمبر نکالنے میں شہرت حاصل کی۔ ان ہی کے زمانے میں بعض خاص نمبروں کو ہندی میں شائع کیا گیا۔ جناب وضاحت حسین رضوی سے پہلے نجیب انصاری بھی ایڈیٹر رہے مگر ان کو کم ہی وقت ملا۔

افسوس کا مقام ہے کہ 'نیادور' کے ۲۷ سال کے شمارے کہیں دستیاب نہیں ہیں اس لئے وثوق سے بتانا مشکل ہے کہ کب 'ہماری آواز' اطلاعات بنا اور پھر کب 'اطلاعات' سے 'اتر پردیش' ہوا اور کس ماہ اور کن سن سے موجودہ 'نیادور' نکالنا شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں جناب علی جواد زیدی یقیناً رہبری کر سکتے تھے مگر افسوس اب وہ بھی نہیں ہیں۔

'نیادور' کا وصف خاص یہ ہے کہ یہ حکومت اتر پردیش کا ترجمان ہے اور محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ کی نگرانی میں نکلتا ہے لیکن یہ ہمیشہ سرکاری بندشوں سے آزاد رہا ہے اور اس کو بھی محض پروپیگنڈہ کے لئے ہی نہیں نکالا گیا بلکہ اس میں ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے ہمیشہ وہ سب کچھ ہوا جو کچھ کہ وہ ایک علمی اور ادبی رسالے سے توقع رکھتے ہیں۔ نیادور نہ صرف کتابت، طباعت اور گیٹ اپ کے لحاظ سے بہترین رسالہ ہے بلکہ اس کا معیار بھی ہمیشہ بہت بلند رہا ہے۔ اس میں ہمیشہ قابل قدر ادیبوں اور شاعروں کے رشحات قلم شریک اشاعت رہے ہیں۔ اس کے معیاری خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ اس کا وقار اور معیار بڑھا رہا ہے۔

'نیادور' کے ۲۷ سال اردو زبان و ادب کی رفتار اور افتاد کو سمجھنے میں انتہائی ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس میں شائع شدہ افسانوں کو اگر یکجا کیا

جائے تو کتنے ہی شاہکار افسانے سامنے آ سکتے ہیں۔ اس کے مضامین مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کر کے کتنی ہی مفید کتابیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ اس کے چھپی غزلیں



قابل قدر ممتاز و مقبول ادیبوں اور شاعروں کا ہمیشہ تعاون حاصل رہا ہے۔ اسی لئے اس کا معیار اور وقار برقرار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی یونیورسٹی کا

شعبہ اردو اس طرف متوجہ ہو اور کسی ایسے طالب علم کو جو تحقیق کا حقیقی ذوق رکھتا ہو اس کو یہ کام سپرد کیا جائے کہ وہ 'نیادور' کے ۲۷ سالہ کارناموں کا جائزہ لے لے اور یہ بتائے کہ مجموعی طور سے 'نیادور' میں کتنے افسانے شائع ہوئے، کتنی کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے۔ شروع سے آخر تک کون کون سے ادیبوں کی تخلیقات اس میں شامل رہی ہیں۔

اردو کے قارئین کو یہ بھی بتانا چاہئے کہ جہاں اردو میں رسائل و اخبارات آکٹھ چھپتے ہیں وہ توڑ دیتے ہیں وہاں ایسے بھی ہوتے جو ۲۷ سال زندہ رہ کر بڑا اعتماد اور وقار حاصل کرتے ہیں۔

دنیا میں ایسے رسائل اور اخبارات ایسے ہیں جن کی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ حیدرآباد سے 'مشیر' کن نے سو سال سے زیادہ عمر پائی پھر اس کا نام بدل دیا گیا۔ قدیم رسائل میں اب کوئی نہیں باقی ہے۔ نہ نگار ہے نہ ندیم نہ زمانہ ہے اور نہ حریم۔ ہاں 'آجکل' ضرور ایک قدیم ماہنامہ ہے جو کہ آزادی سے پہلے ۱۹۳۲ء سے شائع ہوتا آ رہا ہے اور اب بھی معیار برقرار رکھے ہے۔

آستانہ، مولوی، خاتون مشرق جیسے رسائل ضرور ایسے ہیں جو عرصہ دراز سے پابندی وقت سے شائع ہو رہے ہیں ان کے اچھے مخصوص قارئین ہیں جن کی خاصی تعداد ہے۔

اطلاعات کے مطابق اتر پردیش میں فی الوقت 'نیادور' ہی ایک ایسا ماہنامہ ہے جو کہ وقار اور اعتبار برقرار رکھے ہے۔ اپنی عمر کے ۲۷ سال مکمل کر چکا ہے۔ اب نئے ایڈیٹر سہیل وحید کی ادارت میں 'نیادور' نے انقلابی تبدیلیاں کر کے کشش بڑھائی ہے تو وہ لوگ بھی اس میں دلچسپی لینے لگے ہیں جو اس کو روایتی قسم کا سرکاری رسالہ سمجھ کر پڑھنے سے گریزاں رہتے تھے۔

□□□

’نیا دور‘ کے پیشرو اخبار و جرائد آگرہ اخبار ’ہماری آواز‘

’اطلاعات‘ اور ’اتر پردیش‘ کا تاریخی جائزہ



سلمان علی خان

42/238، کٹرہ ابوتراب خاں، نخاس ہکھنؤ

موبائل: 9794114243

پال شرما کی تحقیق کے بموجب ۴ ستمبر، ۱۸۲۷ء کو ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

(ہفتہ وار سنٹارام، ۲۹ مئی، ۱۹۷۶ء، صفحہ ۲)
ہندوستان پر انگریزوں کی حکمرانی کے شروعاتی دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدراس پریسیڈنسی کے انگریز حاکم، رابرٹ کلائیو نے ۲۳ جون، ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں بنگال کے حکمران علی وردی خاں کے جانشین، نواب سراج الدولہ کو ان کے ہی منصب داروں یا رلطف خاں، میرجعفر، مانک چند، راج بلب، رائے دلاب اور

اشاعت پذیر ہوا۔ اس کے بعد انڈیا گزٹ (نومبر، ۱۷۸۰ء) اور کلکتہ گزٹ (فروری، ۱۷۸۳ء) میں شائع ہوئے۔ بنگالی زبان کا پہلا ماہنامہ ’دگ درشن‘ ڈاکٹر جوشا مارشمن نے یکم اپریل، ۱۸۱۸ء کو شائع کیا اور اس کے فوراً بعد بنگالی زبان کا پہلا ہفت روزہ اخبار ’سماچار درپن‘ ۲۳ مئی، ۱۸۱۸ء کو معرض وجود میں آیا، جو ۱۸۳۹ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اس کے برعکس اردو زبان کا سب سے پہلا اخبار ’جام جہاں نما‘ اسی شہر کوکالتا سے اردو اور فارسی کے ممتاز و معروف اور بیباک صحافی، ہری ہردت بنگو نے مئی

ہندوستان میں کلکتہ (اب کوکالتا) کو صرف قدیم فرنگی راجدھانی کا ہی شرف حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ شہر اپنی تاریخی یادگار عمارتوں، بالخصوص فورٹ ولیم کالج، وکٹوریہ میموریل، ہاؤزہ برج اور شیا برج وغیرہ کے علاوہ شعر و ادب کا بچھا ہم مرکز بھی رہا ہے، جہاں دنیا کے ممتاز و معروف شاعر جناب روبندر ناتھ ٹیگور نے ۱۳ / اگست، ۱۹۱۰ء کو بنگالی نظموں پر مشتمل اپنی معرکہ آرا کتاب ’گیتا نجلی‘ تصنیف کر کے دنیائے ادب میں دھوم مچا دی تھی، جس پر انھیں عالمی نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا تھا۔ صرف اتنا ہی



جگت سیٹھ وغیرہ کی سازش کے سبب جب شکست کا سامنا کرنا پڑا تو نتیجتاً بنگال پر انگریزوں کی حکمرانی شروع ہو گئی اور تہجی انھوں نے اپنی اس فتح کو یادگار بنانے کی غرض سے کلکتہ میں ایک بڑے شاندار قلعہ کی تعمیر کی، جس کا نام انھوں نے ’فورٹ ولیم رکھا، جو بعد میں ’فوجی چھاونی‘ اور ’کالج‘ کی ملی جلی شکل اختیار کرنے والا ’یہ مرکز اردو نثر کے فروغ کا مضبوط قلعہ ثابت ہوا اور ۱۸۰۰ء سے اس کالج کا بنیادی مقصد ہندوستان میں تعلیم کو فروغ دینا، انگریز

سدا سکھ مرزا پوری کی ادارت میں ۲۷ مارچ، ۱۸۲۲ء کو بروز بدھ شائع کیا تھا، جس کی تاریخ اجراء کے موقع پر مہبان اردو، بالخصوص اردو صحافی ہر سال ’یوم اردو صحافت‘ منعقد کرتے رہتے ہیں۔ اس کے چار سال بعد صوبہ شمالی و مغربی (اب اتر پردیش کے) جگل کشور کا پوری نے ۳۰ مئی، ۱۸۲۶ء کو ہندی کا پہلا اخبار ’اودنت مارتنڈ‘ شائع کرنے کے ساتھ ہی اسی نام سے کوکالتا میں ہی اپنا پرنٹنگ پریس بھی قائم کیا۔ لیکن ہندی کا یہ اولین اخبار شرعی

نہیں، بلکہ موصوف نے کوکالتا میں ہی تاریخ ساز فورٹ ولیم کالج کی ہی طرز پر ایک مثالی تعلیمی ادارہ ’شانتی بھیتن‘ قائم کر کے زبردست شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ یہی وہ شہر عظیم ہے، جہاں انگریزی، بنگالی، اردو، فارسی اور ہندی زبانوں کے اولین اخبارات کی اشاعت عمل میں آئی۔ سب سے پہلے مسٹر جیمس گسٹس بگلی کی ادارت میں انگریزی کا سب سے پہلا اخبار - ’یکیز بنگال گزٹ آر جنرل ایڈورٹائزر‘ کوکالتا سے ۲۹ جنوری، ۱۷۸۰ء کو

افسروں کی تربیت کرنا اور برطانوی حکومت کا استحکام قرار پایا۔“

(روزنامہ آگ بھنگ، ۱۲ اپریل، ۲۰۱۸ء، صفحہ ۷)

اس کے بعد انگریزوں نے بنگال کے مشہور شہر کلکتہ کو ہی اپنا دارالسلطنت بنایا۔ لیکن بعض ناگزیر اسباب کی بناء پر ۱۹۱۲ء میں انگریز حکمرانوں نے اپنا دارالسلطنت کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا، جہاں اپنی آسائش کے لئے ایک شاندار رہائش گاہ ’انسراے ہاؤس‘ کے نام سے تعمیر کرائی، جو ہندوستان کی آزادی کے فوراً بعد ’راشٹریہتی بھون‘ کہلانے لگا اور صدر جمہوریہ ہند کا شاندار اور قابل دید مسکن بن گیا۔ اسی زمانہ میں مجاہد آزادی اور بیباک صحافی، مولانا محمد علی جوہر نے مرکزی راجدھانی کی دہلی منتقلی کے باعث کلکتہ سے شائع ہونے والے اپنے بیحد مقبول اور موثر انگریزی اخبار ’کامریڈ‘ کو دہلی سے شائع کرنا شروع کر دیا، جو ’انسراے‘ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اہلیہ لیڈی ’انسراے‘ کا بھی بیحد پسندیدہ اخبار تھا۔ اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر نے دہلی کے کوچہ چیللاں سے ۲۳ فروری، ۱۹۱۳ء کو روزنامہ ’بھدرڈ‘

جاری کیا۔“

(تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم، صفحہ ۲۹۳)

انگریز حکام نے دہلی سے ملحق تاریخی شہر آگرہ کو ’صوبہ شمالی و مغربی‘ کا دارالسلطنت مقرر کیا۔ صرف اتنا ہی نہیں،

بلکہ ’انسراے‘ لارڈ کرزن نے سب سے پہلے کلکتہ میں ہی اپنی آسائش کی غرض سے ’گورنمنٹ ہاؤس‘، تعمیر کرنے کے بعد اس نے شملہ (ہماچل پردیش) میں ’انسراے‘ لاج‘ بھی تعمیر کروائی، جبکہ صوبہ شمالی و مغربی کے لفٹیوٹ گورنر سرائیوٹی میکڈونالڈ نے ۱۸۹۵ء میں موسم گرما کی صوبائی راجدھانی نین تال (اتراکھنڈ) میں گورنمنٹ

ہاؤس تعمیر کروایا، جو آزادی کے بعد ’راج بھون‘ کہلایا۔

(Raj Bhawan, Nainital:A.

Scotish Castle In Kumaon Highlands, By Arun Prakash, P-16)

تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۱۸ء میں شروع ہونے والی پہلی جنگ عظیم کے دوران یورپی ممالک، بالخصوص برطانیہ نے اپنی جارحانہ اور غاصبانہ جنگی کارروائی کے ذریعہ ترکی پر قبضہ کر کے خلافت اسلامیہ کا



خاتمہ کر دیا، جس کے باعث مسلمانوں میں انگریز حکمراں کے خلاف زبردست غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنے تحقیقی مقالہ ’تحریک آزادی میں اردو کا حصہ‘ میں رقمطراز ہیں کہ ”انگریزوں سے

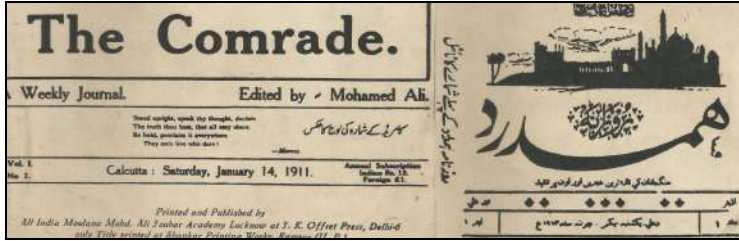
پرنسپل کی سخت مخالفت کرتے ہوئے تمام حریت پسند طلبا نے اپنے درجات کا بائیکاٹ کر دیا، جن کی تعلیم کے لئے اسی یونیورسٹی کی جامع مسجد میں ہی ان کی پڑھائی کا متبادل بندوبست کرنے کی غرض سے ’جامعہ ملیہ اسلامیہ‘ کا قیام عمل میں آیا، جس کے جلسہ تاسیس کو خطاب کرتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے عدم تعاون تحریک کے سیاق و سباق میں طلباء کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ ”مجھے لیڈروں سے زیادہ ان نونہال وطن کی ہمت بلند پر آفریں اور شاہاں کہنا چاہیے کہ وہ موائٹ انصاری کے ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے اور اپنی عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔ مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار (انگریزوں) کے اثر سے مطلقاً آزاد ہو۔۔۔۔۔۔ ہماری عظیم الشان متحدہ قومیت کا اب یہ فیصلہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے (انگریزوں کی غلامی کے لئے) بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں۔“

(جامعہ کہانی: عبدالغفار مدہولی، ۲۰۰۳ء، صفحہ ۲۷)

مولانا ابوالکلام آزاد پوری دل جمعی

کے ساتھ مہاتما گاندھی کی قیادت میں شروع کی گئی عدم تعاون تحریک میں سرگرم عمل ہو گئے اور کلکتہ سے الہلال، البلاغ اور پیغام جیسے انقلابی اخبارات شائع کر کے قوم کی

ایسی زبردست رہنمائی کی کہ جس کی مثال مفقود ہے۔ مولانا دراصل گاندھی جی سے بہت متاثر تھے، جس کی وجہ سے وہ مسلسل جہد آزادی کی تحریکوں میں شامل رہے، جس کے اہم ارکان میں ان کا شمار ہونے لگا اور ایک ہر دل عزیز قومی رہنما کی حیثیت سے بہت ہی جلد انھیں زبردست شہرت و مقبولیت حاصل ہو گئی، جن کی جہد آزادی سے تحریک حاصل کرتے ہوئے ’ہندوستانی قومیت‘ کے جذبہ سے سرشار ہو کر ہندو اور

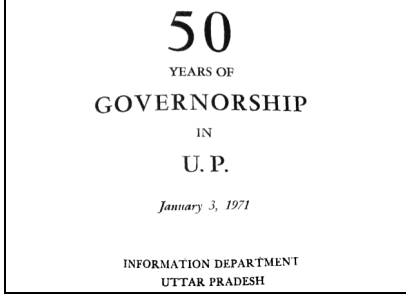


ناراضگی کی ایسی ’فضا پورے بر عظیم ہند پر مسلط ہو گئی کہ ہر قیمت پر پہلے انگریزوں کو نکالا جائے۔ چنانچہ مسلمان اور ہندو مل کر پوری قوت سے اس جدوجہد (آزادی) میں مصروف ہو گئے۔“

(صفحہ ۳۵۶)

نتیجتاً ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں عدم تعاون تحریک کا آغاز ہوا اور ۲۹ اکتوبر، ۱۹۲۰ء کو سب سے پہلے علی گڑھ یونیورسٹی کے انگریز

ولیم کیری کے بیان کے مطابق ”ڈاکٹر ہنڈرسن نے آگر اخبار کے نام سے دیہی زبان کا اخبار فارسی رسم خط میں جاری کیا۔“



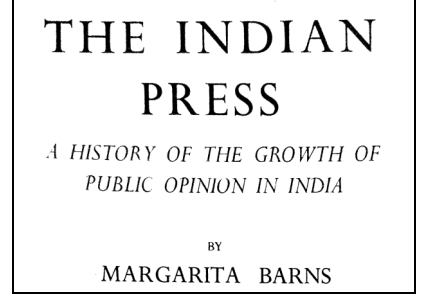
(Good Old Days of Hon'ble John Company, Page 447-448)

آگرہ اخبار کے بارے میں فن صحافت کے مؤرخ، محمد عتیق صدیقی رقمطراز ہیں کہ ”نیشنل آرکائیوز نئی دہلی، میں آگرہ اخبار کے سلسلہ میں بعض سرکاری یادداشتیں اور مدیر اخبار، ڈاکٹر ہنڈرسن کے چند خطوط محفوظ ہیں، جو آگرہ اخبار کے بارے میں صحیح حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس اخبار کی اشاعت کے لئے ڈاکٹر ہنڈرسن نے اپنے آگرہ اخبار کو اور زیادہ بہتر اور جاذب نظر بنانے کی غرض سے آگرہ میں اپنا ایک پرنٹنگ پریس بھی ۱۸۳۱ء میں قائم کیا۔ لیکن ان کا یہ اخبار ہندوستانیوں میں مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ اسی لئے ہنڈرسن نے مایوس ہو کر نومبر، ۱۸۳۲ء میں اردو زبان کے آگرہ اخبار کو انگریزی کا اخبار بنا دیا۔“

کیا، جو بقول مولانا مادد صابری ”اس اخبار کی حق گوئی نے اس کو تھوڑے عرصہ میں ہی مقبول عام بنا دیا۔ یہ اخبار جلد ہی اپنی آزادی رائے، بے لاگ تنقید و تبصرے اور زور بیان کے اعتبار سے بہترین اخباروں میں شمار ہونے لگا تھا اور اخبار ریاست مظلوموں اور ستم رسیدوں کا ترجمان بن گیا تھا۔ (تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم، مرتبہ مولانا مادد صابری، صفحہ ۹۳۰)

ہندوستان کے شمالی خطہ میں واقع ریاست اتر پردیش اپنی گونا گوں خصوصیات کے سبب عالم میں انتخاب رہی ہے۔ لیکن جب اسے علیحدہ ریاست کا درجہ تفویض کیا گیا تو اس کا دارالسلطنت اکبر آباد (آگرہ) کو بنایا گیا۔ تہجی برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کی انگریزوں کے خلاف بڑھتی ہوئی منافرت اور دشمنی کو کم کرنے نیز ان میں اپنی ہر دلعزیزی بڑھانے کی غرض سے اردو زبان میں ایک ایسا اخبار شائع کرنے کا فیصلہ کیا، جس میں انگریز حکمرانی کی حمایت میں ایسے مضامین شائع کئے جائیں، جسے پڑھ کر ہندوستانیوں میں فریگیوں کے خلاف نفرت میں کمی واقع ہو سکے اور ان کے حق میں حالات سازگار ہو سکیں۔ یہی ۲۴-۱۹۲۳ء کا وہ زمانہ تھا کہ انگریزوں کے قائم کردہ محکمہ داخلہ کے اسٹنٹ سکریٹری سے ڈاکٹر ہنڈرسن نے ملاقات کر کے آگرہ اخبار شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ مسٹر

مسلمان متحد ہو کر عدم تعاون تحریک میں پوری سرگرمی سے شریک ہوئے اور انگریزوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے بڑی تعداد میں گرفتاریاں دیں اور قید و



بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ اس سلسلہ میں صحافت کی ممتاز و معروف انگریز مصنف مارگریٹا بارنس نے اپنی تصنیف ’دی انڈین پریس‘ میں عدم تعاون تحریک میں گرفتار ہونے والے مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے ان کی جو تعداد جنوری میں ۱۳۸۰۳ بتائی تھی، وہ فروری میں بڑھ کر ۱۷۸۱۸ ہو گئی۔“

(صفحہ ۳۹۵)

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت تیز رفتاری کے ساتھ بتدریج بڑھتی ہی گئی اور پورا ملک دیکھتے ہی دیکھتے ’انقلاب زندہ باد‘ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اسی زمانہ میں دہلی کی جامع مسجد کے قُرب میں واقع اردو بازار سے سردار دیوان سنگھ مفتون نے ۱۹۲۲ء میں اپنا حریت پسند اخبار ہفتہ وار ریاست شائع کرنا شروع

مقام	مطبوع	اخبارات			مطبوعات
		اخبار	ادبیر	اشاعت	
آگرہ	زبدۃ الاخبار	منشی وادعلی خاں	۵۳	۶۳۶	۰
آگرہ	نورالابصار	منشی سدا سکھ لال	۲۴۲	۱۳۲۲	۶۵۰۰
آگرہ	نورالابصار	منشی سدا سکھ لال	۲۱۶	۱۲۹۰	۰
آگرہ	اکبری	منشی خادم علی	۳۶	۲۳۲	۰
آگرہ	قادیسی	قطب الاخبار	۳۳	۲۹۶	۰
آگرہ	اسعد الاخبار	منشی قوالدین خاں	۴۴	۲۶۴	۲۰۳۲۵
آگرہ	اسعد الاخبار	منشی قوالدین خاں	۰	۵	۰
آگرہ	جام جمشید	بابوشب چند ناکھ	۵۵	۰	۰
آگرہ	آگرہ کالج	اخبارات مختلف	۵۵	۶۴۸	۲۳۱۱
آگرہ	مصدقہ المذاہر	اخبارات نواح	۴۰	۳۰۰	۱۱۶۰

مطبوعات	
۶۱۸۲۸	مرتبہ رورٹ
۶۱۸۲۹	ایشیا
۶۱۸۵۰	ایشیا
۶۱۸۵۱	ایشیا
۶۱۸۵۲	ایشیا
۶۱۸۵۳	ایشیا
۶۱۸۵۴	ایشیا
۶۱۸۵۵	ایشیا
۶۱۸۵۸	ایشیا

(صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، مرتبہ محمد عتیق صدیقی، صفحہ-۵۳)

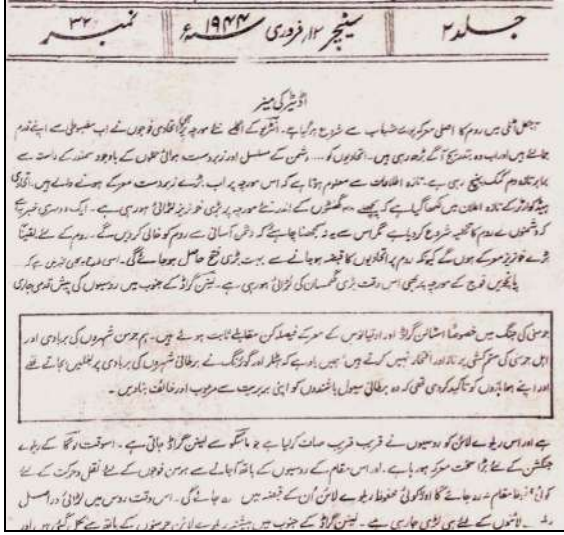
محمد عتیق صدیقی کی متذکرہ تصنیف دراصل ایک سرکاری رپورٹ کی چوتھی جلد کے مندرجات پر مبنی ہے، جس میں ’دیسی مطالع کے زیر عنوان ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۳ء تک کی وہ رپورٹیں بھی شامل کی گئیں ہیں، جن کا اسی صوبہ کے اخبارات و مطالع سے براہ راست تعلق تھا۔ اس باب کے آخر میں ۱۸۵۸ء کی رپورٹ بھی شامل کر دی گئی تھی، جو مختصراً اور اجمالی ہونے کے باوجود بیحد اہم ہے۔ یہ چھ برسوں کی سرگزشت (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۳ء) جو ۱۶۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مولف

ان رپورٹوں کے وجود سے بے خبر تھا۔ اسی دوران ایک نوجوان ’ہم تحقیق‘ دوست شری سچ دیو کو یہ رپورٹیں ملیں، جو ’انیسویں صدی کے نصف اول کی دلی اور اس کے قرب و جوار کی



دایاں ابرہہ موسیٰ نے ہونے پر جو نقشہ ہمایوں کی ہے

کاش! صحافت کے ان محققین نے اخبار و مطالع کی چوتھی جلد سے پہلے شائع ہونے والی تیسری، دوسری اور جلد اول کے بارے میں بھی ضروری تحقیق کر کے درکار معلومات فراہم کر دی ہوتیں تو ’آگرہ اخبار‘ جیسے متعدد گننام اخبارات کی مکمل تفصیل اور متعلقہ معلومات یقیناً معرض وجود میں آ جاتیں۔ اسی فروگزاشت کے سبب یہ پتہ لگا پانا دشوار ہو گیا ہے کہ آگرہ اخبار اردو زبان میں دوبارہ کب شائع ہوا اور اس کی اشاعت کب تک جاری رہی۔ کیونکہ ۱۹۳۴ء میں انگریز حکام نے سرکاری زبان، ’فارسی‘ کو جب کا لہجہ قرار دے کر فارسی رسم الخط کی مقبول عام زبان ’اردو‘ کو



۳۲ نمبر

جاتا ہے، ۱۸۴۴ء تک بنگال پریسیڈنسی میں شامل رہا ہے۔ ریاست کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کی غرض سے اس صوبہ کے دارالسلطنت کو ’آگرہ‘ سے الہ آباد منتقل کر دیا گیا۔ اتر پردیش کے ۹ ویں گورنر ڈاکٹر بیجو اڑہ گوپال ریڈی (مدت کار: یکم مئی، ۱۹۶۷ء تا ۳۰ جون، ۱۹۷۲ء) نے ۳ جنوری، ۱۹۷۱ء کو اتر پردیش میں گورنرشپ کے ۵۰ سالہ جشن کے انعقاد کے موقع پر منعقدہ ایک تقریب کو خطاب کرتے ہوئے اتر پردیش کی تشکیل سے متعلق اہم تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا تھا کہ ’’اتر پردیش ۱۹۳۴ء تک بنگال پریسیڈنسی میں شامل رہا تھا، جسے تبھی اس سے

علحدہ کیا گیا اور اسے ۱۹۳۶ء میں ’صوبہ شمالی و مغربی‘ کے نام سے موسوم کیا گیا، جس کی سربراہی کے لئے ایک لفٹیننٹ گورنر کی تقرری بھی کی گئی اور ۱۹۰۲ء میں اس صوبہ کا نام پہلے ’صوبہ متحدہ آگرہ و

عدالتی اور سرکاری زبان کا درجہ تفویض کر دیا تھا تو یہ مکمل وثوق کے ساتھ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اُس وقت جبکہ اردو زبان سرکاری زبان بن چکی تھی تو آگرہ اخبار یقیناً اردو زبان میں دوبارہ شائع ہونے لگا ہوگا۔ البتہ آگرہ اخبار کے علاوہ اسی زمانہ میں اردو کے متعدد اخبار شائع ہوئے، جن کی تفصیل محمد عتیق صدیقی کی تصنیف ’صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات میں شائع شدہ آگرہ کے اخبارات کی تفصیل منسلکہ ذیل گوشوارہ کے بموجب ملاحظہ فرمائیں۔

شمالی ہند کا یہ اہم خطہ، جسے اب اتر پردیش کہا

سماجی و اقتصادی زندگی‘ کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقی کام کر رہے تھے۔ انھوں نے ازراہ علم دوستی، یہ رپورٹیں مجھے دکھلائیں۔ اس عنایت کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں۔‘ (ایضاً، صفحہ ۷۷ و ۱۲)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ صوبہ متحدہ و مغربی (اب اتر پردیش) کے محکمہ داخلہ کے، جن انگریزی داں اور انگریز پرست اسسٹنٹ سکرٹریوں نے انتہائی دلچسپی اور دیدہ ریزی کے ساتھ یہ رپورٹ مرتب کی تھی، ان کے نام اور عہدہ کی تفصیل محمد عتیق صدیقی کے بموجب یہ ہے:

اودھ رکھا گیا۔ اس کے بعد اس ریاست کا نام ’صوبہ متحدہ‘ رکھ دیا گیا اور لکھنؤ میں واقع سردھنا (مظفرنگر کی مشہور بیگم سمو کی قیام گاہ، ’کوٹھی حیات بخش‘ کو ’گورنمنٹ ہاؤس‘ بنایا گیا، جو ہندوستان کی آزادی کے بعد ’راج بھون‘ کہلایا۔ ہندوستان میں ۲۶ جنوری، ۱۹۵۰ء کو اس صوبہ متحدہ کا نام بالآخر ’اتر پردیش‘ رکھ دیا گیا۔

یاد رہے کہ صوبہ متحدہ (United Provinces) کے دارالسلطنت کو آگرہ سے جب ۱۹۰۲ء میں الہ آباد منتقل کیا گیا تو دوسری جنگ عظیم

(۱۹۳۹ء) کے دوران الہ آباد گلکٹر بیٹ میں قائم شدہ 'وار آفس' کے زیر اہتمام محکمہ داخلہ کے اسٹنٹ سکریٹری، جناب مشیر احمد علوی 'ناظر کا کوروی' کی ادارت میں ۱۳ جولائی، ۱۹۳۳ء کو الہ آباد سے اس

رہبری کر سکتے ہیں اور انہیں کرنا بھی چاہئے۔ کیوں کہ یہ مفید معلومات ہوں گی۔ (نیادور، نصف صدی نمبر، ص ۱۰۲)

جس کے چیف ایڈیٹر الہ آباد کے ڈپٹی گلکٹر، مسٹر کھڑک سنگھ تھے۔ ہماری آواز کا سالانہ چندہ اُس وقت تین روپیے اور ششماہی چندہ ڈیڑھ روپیے تھا۔ اس اخبار کی جلد ۲، شمارہ نمبر ۳۲، مورخہ ستمبر، ۱۲ فروری، ۱۹۳۳ء سے جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۱۵ و ۱۶ تک کے شمارے جناب ابراہیم علوی کے توسط سے راقم الحروف کے پاس محفوظ ہیں۔ اس مصور ہفت روزہ 'ہماری آواز' کے سرورق کے بعد پہلے صفحہ پر اخبار کا



سے قبل شائع ہونے والے اردو اخبار 'آگرہ اخبار' کی ہی طرز پر ایک ہفتہ وار مصور اخبار 'ہماری آواز' کی اشاعت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس اخبار کے بارے میں ماہنامہ 'نیا دور' کے تمام مدیران، جس میں

نیا دور کے بانی مدیر، مرحوم جناب علی جواد زیدی صاحب کیسے ناواقف رہ گئے کہ اپنی سرگزشت حیات میں 'ہماری آواز' کا ذکر تک نہیں کیا۔

عظیم کا آغاز ہوا تو ہندوستانیوں میں فوج میں بھرتی ہونے کا جذبہ استوار کرنے کی غرض سے 'آگرہ اخبار' کی ہی طرز پر الہ آباد گلکٹر بیٹ میں قائم شدہ 'وار آفس'

نام، جلد نمبر و شمارہ نمبر اور تاریخ کے علاوہ مدیر اخبار، جناب مشیر احمد علوی 'ناظر کا کوروی' کا ادارہ ایڈیٹر کی میز کے دائیں جانب ایک تصویر مندرج رہتی تھی، جس کی تفصیل منسلک ہے۔



اس سلسلہ میں میری فکر میرے رفیق خاص اور ممتاز و بیباک صحافی، جناب احمد ابراہیم علوی کی اس فکر سے ملتی ہے کہ یہ بات 'وثوق سے بتانا مشکل ہے کہ نیا دور سے پہلے کب 'ہماری

'آواز'، اطلاعات بنا اور پھر کب 'اطلاعات' سے 'اتر پردیش' ہوا اور کس ماہ اور کس سنہ سے موجودہ 'نیا دور' نکلنا شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں جناب علی جواد زیدی یقیناً

میں تعینات اسٹنٹ سکریٹری، جناب مشیر احمد علوی 'ناظر کا کوروی' کی ادارت میں ۱۳ جولائی، ۱۹۳۳ء کو ہفتہ وار مصور سرکاری اخبار 'ہماری آواز' جاری کیا گیا تھا،

اس مصور اخبار 'ہماری آواز' کی افادیت و اہمیت صرف یہ تھی کہ اس میں ۱۹۳۹ء کی دوسری جنگ عظیم سے متعلق خبروں اور اداریوں کی اشاعت کو اولیت حاصل تھی۔

صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ہماری 'آواز' کی یہ بھی ایک بڑی خصوصیت تھی کہ اس کے ایڈیٹر، مشیر احمد علوی، ناظر کا کوروی نہ صرف خود شاعر اور ادیب تھے، بلکہ وہ اپنے

اس مصور اخبار میں مقامی اور غیر مقامی ادبا و شعراء کی تخلیقات کی اشاعت کو مسلسل ترجیح دیتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر الہ آباد گلگھڑی پکھری میں زیادہ اناج پیدا کرنے کی اسکیم کی عمل آوری سے متعلق تصویر کے نیچے سپاہی کے گیت، عنوان سے مسٹرنروش پریسی کی ایک نظم کے علاوہ ایک فوجی کی تصویر کے نیچے لکھنؤ کے مشہور و مقبول شاعر و ادیب، شوکت تھانوی کی ایک نظم بھی شائع ہوئی تھی، جس میں 'جا رہا ہے ایک سپاہی جنگ کے میدان میں' عنوان سے شائع ہوئی تھی جو سنسکرت ہے۔

'ہماری آواز' کے مدیر، جناب مشیر احمد علوی نے اپنے ادارہ کی میزبانی اور فوجی کامیابی و کی سرگرمیوں، فوجی حکمت عملی اور فوجی کامیابی و کامرانی کا ذکر کرتے ہوئے ایک انتہائی دلچسپ کپشن بھی مندرج کیا تھا، جس میں ایک چوہے کے کاٹھن کے سامنے یہ پرکشش جملہ لکھا گیا تھا:

"تیرا میرا دشمن جانی، یہ چوہا جاپانی"

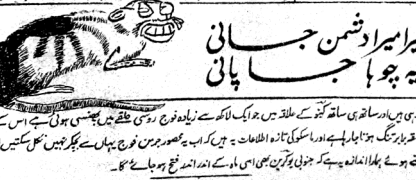
ہماری آواز' کے ایڈیٹر، جناب مشیر احمد علوی ناظر کا کوروی نے دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور جاپان پر مسٹر چرچل کی کامیابی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے درج ذیل ادارہ پر سپردِ قلم کیا تھا:-

'ہماری آواز' کے ایڈیٹر، جناب مشیر احمد ناظر کا کوروی صرف جنگ ۱۹۳۹ء کے بارے میں خبریں اور مضامین ہی شائع نہیں کرتے تھے، بلکہ برائے تبصرہ موصول ہونے والی ادبی کتب اور شعری مجموعوں پر بھی باقاعدہ تبصرہ کر کے اپنے مصور اخبار 'ہماری آواز' میں برابر شائع کرتے رہتے تھے۔ مشہور و مقبول شاعر فراق گورکھپوری کی کتاب پر ہماری آواز کے یکم جنوری و ۱۵ جنوری، ۱۹۴۵ء میں شائع شدہ ناظر کا کوروی کا تبصرہ بیحد اہمیت کا حامل ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب صوبہ متحدہ میں ۳ جنوری، ۱۹۲۱ء کو سر اسپینسر ہارکورت ہٹلر کو ترقی دیکر گورنر بنا یا گیا تھا، تو ان کے بعد ۹ گورنر مقرر ہوئے۔

ان گورنروں میں انگریزوں کے علاوہ صرف ایک ہندوستانی گورنر مقرر ہوئے، جن کا نام تھا، محمد احمد سعید خاں چھتاری۔ موصوف نے راج بھون کے پورٹریکو کے سامنے لان کے سب سے آخر میں ایک بہت ہی خوبصورت بارہ دری بنوائی تھی۔ مسٹر ہٹلر نے ہی ۱۹۲۲ء میں صوبہ متحدہ کی راجدھانی الہ آباد سے لکھنؤ منتقل کر دی تھی اور سکریٹریٹ کے محکمہ داخلہ سے ملحق ایک نیا شعبہ اطلاعات قائم کیا گیا تھا، جس میں سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں مرحوم جناب صباح الدین عمر صاحب کی تقرری باضابطہ عمل میں آئی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کے چھوٹے بھائی اور ممتاز و معروف صحافی،

جناب ندیم الرحمن قدوائی کی تقرری بھی نظامت اطلاعات میں باقاعدہ عمل میں آئی۔ مرحوم قدوائی صاحب، حضرت گنج لکھنؤ میں واقع اسٹیٹ انفارمیشن سنٹر نیز لائبریری کے بانی انچارج تھے، جسے انھوں نے ذاتی دلچسپی کے لیے زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب اور پرکشش بنانے میں کوئی کٹھن نہیں رکھی تھی۔ ان سب افسران کے بعد محترم جناب علی جواد زیدی صاحب کی تقرری بھی نظامت اطلاعات میں عمل میں آئی۔ جناب مشیر احمد علوی ناظر کا کوروی کی ادارت میں ہفت روزہ 'ہماری آواز' کی اشاعت کے بعد



مرحوم جناب صلاح الدین عثمان صاحب نیا دور کے نصف صدی نمبر میں رقمطراز ہیں: "صبح الدین عمر صاحب کے بغیر رسالہ 'نیا دور' کا ذکر نا تمام رہتا ہے۔۔۔۔۔ ۱۹۳۷ء میں وہ پبلک سروس کمیشن کے ایک مقابلہ کے امتحان میں بیٹھے۔ یہ امتحان تھا محکمہ اطلاعات کے لئے 'صحافی کے عہدہ کا۔ امتحان میں کامیاب ہونے پر وہ انگریزی زبان میں شائع ہونے والی کتب و رسائل کے ذمہ دار (In-Charge - English Publications) بنائے گئے۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزارا تھا کہ ان کو اردو زبان میں اشاعت کا بہت سا کام سونپ دیا گیا۔ چنانچہ اس کام

کے لئے ایک الگ ڈائریکٹریٹ آف انفارمیشن قائم ہوا۔ اس نظامت کے قائم ہونے کے بعد صباح الدین صاحب کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں پبلسٹی کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ اس پر مزید یہ کہ ان کو انگریزی کے ماہوار رسالہ اتر پردیش کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا حکم دیا گیا اور انھوں نے یہ سب ذمہ داریاں بخوشی قبول کر لیں۔ (صفحہ ۱۰۷)

صبح الدین عمر صاحب کی ہی ادارت میں 'اطلاعات صوبہ متحدہ' نام سے ایک نیا جریدہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ محترم جناب صباح الدین عمر کے بعد جناب مولوی فرحت اللہ انصاری فرنگی محلی اور جناب ندیم الرحمن قدوائی کی تقرری بھی نظامت اطلاعات میں باقاعدہ عمل میں آئی۔ مرحوم قدوائی صاحب، حضرت گنج لکھنؤ میں واقع اسٹیٹ انفارمیشن سنٹر نیز لائبریری کے بانی انچارج تھے، جسے انھوں نے ذاتی دلچسپی کے لیے زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب اور پرکشش بنانے میں کوئی کٹھن نہیں رکھی تھی۔ ان سب افسران کے بعد محترم جناب علی جواد زیدی صاحب کی تقرری بھی نظامت اطلاعات میں عمل میں آئی۔ جناب مشیر احمد علوی ناظر کا کوروی کی ادارت میں ہفت روزہ 'ہماری آواز' کی اشاعت کے بعد

صبح الدین عمر صاحب کی ہی ادارت میں محکمہ داخلہ کے شعبہ اطلاعات کے زیر اہتمام 'اطلاعات صوبہ متحدہ' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار یکم جنوری، ۱۹۴۶ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں محترم جناب علی زیدی صاحب رقمطراز ہیں کہ "رفتہ رفتہ اطلاعات کے 'آزادی نمبر' اور 'گاندھی نمبر' نکلنے لگے۔ (دوماہی اکادمی لکھنؤ، صباح الدین عمر نمبر، صفحہ ۲۰) ممتاز محقق جناب عرفان عباسی صاحب بھی اطلاعات کے ان دونوں خصوصی شماروں کے بارے میں رقمطراز ہیں 'اس کے دو خاص نمبر یعنی ۱۵ اگست کو یوم آزادی نمبر' اور 'اکتوبر میں 'گاندھی جینٹی نمبر' نکلتے

تھے۔ اس وقت ۱۹۴۹ء کے یہ دونوں نمبر میرے سامنے ہیں۔ ۱۵ اگست کی ضخامت ۱۳۶ صفحات ہے، قیمت آٹھ آنہ درج ہے اور گاندھی جینتی نمبر کی ضخامت ۸۸ صفحات ہے اور آٹھ آنہ قیمت درج ہے۔ ان دونوں نمبروں میں جن اہم ادبی شخصیات کی تخلیقات شائع ہوئی تھیں، ان میں فراق گورکھپوری، پروفیسر محمد مجیب، حیات اللہ انصاری، سراج لکھنوی، علی عباس حسینی، شمیم کرہانی، عبادت بریلوی و امق جوہپوری، اعظم حسین اعظم، پروفیسر محمد سلطان، اسلم لکھنوی، غلام احمد فرقت، اُپنڈر ناتھ اشک، نیاز فتح پوری، پروفیسر محمد عقیل، ساغر نظامی، صالحہ عابد حسین، اثر لکھنوی، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، کشن پرشاد کول، انتصار نیوتوی، آندران مل اور ڈاکٹر سید محمود وغیرہ شامل ہیں۔“ (صفحہ ۸۹)

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ماہنامہ اطلاعات دراصل ایک معیاری ادبی جریدہ تھا۔ اس کے باوجود اطلاعات کا نام زیدی صاحب کو برابر کھلتا رہا اور اس کا نام تبدیل کر کے اسے ’نیادور‘ بنانے پر مسلسل کوشاں رہے۔ اس ضمن میں محترم جناب علی زیدی صاحب اپنی سرگزشت حیات ’یادوں کی رھگڑوں سے متعلق کشمکش حیات‘ کے تحت رقمطراز ہیں: ”ہمارے زیادہ تر اصحاب و کالت، اخبار نویس یا تعلیمی شعبوں کی طرف مائل ہو گئے۔ خود میں نے بھی اعظم گڑھ میں وکالت کی ابتدا کی۔۔۔ محترم سید بشیر حسین زیدی کے اصرار پر میں نے اعظم گڑھ کے بجائے غازی پور میں باقاعدہ وکالت کا آغاز کیا۔۔۔ تین چار سال مشکل سے گزرے ہوں گے کہ لکھنؤ کی یادستانے لگی۔ اسی دوران کیشو دیو مالویہ وار غازی پور ہوئے۔ اُن کا تعلق پنڈت مدن موہن مالویہ کے خانوادہ سے تھا اور وہ اتر پردیش حکومت میں پارلی منٹری سکریٹری تھے۔ ملاقات ہونے پر مجھ سے کہنے لگے کہ ”اماں زیدی! ہندوستان گیر سیاست میں حصہ لینے کے بعد اس

چھوٹے سے شہر غازی پور میں تمہارا دل کیسے لگتا ہے؟“ میں نے جواب دیا: ”شادی کے بعد میرے سر بڑی ذمہ داریاں آ پڑی ہیں۔ کیشو دیو جی مسکرائے اور شدید اصرار کیا کہ تمہیں لکھنؤ جیسے مرکزی شہر کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔ تمہارے جیسے ذہین نوجوان کے لئے، جس کے پس پشت بہت سے ادبی اور سیاسی کارنامے ہیں، لکھنؤ آنا مشکل نہ ہوگا۔“ اس طرح زیدی صاحب کو اپنے پرانے لکھنؤ میں نئی زندگی شروع کرنے کا موقع ملا۔

زیدی صاحب لکھنؤ میں اپنی سرکاری ملازمت کے بارے میں خود رقمطراز ہیں کہ ”میں حکومت اتر پردیش کے محکمہ اطلاعات میں ۱۹ جولائی، ۱۹۴۶ء کو انفر



انچارج، شعبہ اردو کی حیثیت سے وارد ہوا۔ میرے آنے کے پہلے اردو، ہندی اور انگریزی کے شعبہ الگ نہیں تھے۔ میرے ہی ساتھ ہندی شعبہ کے انچارج و دیا بھاسکر جی تھے، (جو بعد میں ہندی روزنامہ ”آج“ کے ایڈیٹر ہوئے۔) اور شرعی پی پی سنگھ شعبہ انگریزی کے انچارج تھے، (جو پہلے پنجاب یونیورسٹی میں صدر شعبہ صحافت رہ چکے تھے۔) ڈاکٹر محمود الظفر (نام ٹھیک سے یاد نہیں) ۱۹۳۷ء میں اردو کے ڈپٹی ڈائریکٹر ضرور مقرر ہوئے تھے۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں جنگ (عظیم) کے سوال پر پہلی کانگریسی وزارت مستعفی ہوئی تو وزراء کے ساتھ ہی

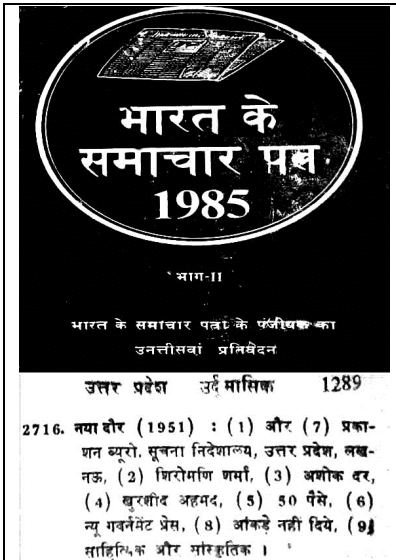
ڈاکٹر (محمود الظفر) صاحب نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ ڈائریکٹر (اطلاعات) مسٹر اگرا تھے، جن کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم گھرانہ سے تھا۔ وہ اردو سے خاص شغف رکھتے تھے۔ سکریٹری (اطلاعات) سر تیج بہادر سپرو کے فرزند ارجمند، آندرانائن سپرو، آئی سی ایس تھے۔ اس خوشگوار فضا میں محکمہ (اطلاعات) کی تنظیم نو کے منصوبے بنے۔ وزیر اطلاعات سپورنا نند جی تھے، جو ہندی پرستی کے علاوہ اردو میں شعر بھی کہتے تھے اور آندرتخلص کرتے تھے۔ اُن کے پارلی منٹری سکریٹری، کیشو دیو مالویہ، پنڈت مدن موہن مالویہ کے خاندان کے چشم چراغ تھے۔ میں پہلے سے ہی شعبہ اردو کے اہم کارکنوں سے واقف تھا اور وہ بھی مجھے جانتے تھے۔ ان میں فرحت اللہ انصاری فرنگی محلی، اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نمایاں اراکین میں رہ چکے تھے، اس واسطے سے اُن سے تعلقات نسبتاً زیادہ ہی تھے۔ وہ اچھے حافظ اور اچھے مقرر بھی تھے۔ صباح الدین عمر صاحب سے سیاسی قربت تو نہ تھی۔ لیکن ایک اور قربت اُن کے وطن نگرام کی بدولت پیدا ہوئی۔ شعبہ کے ایک اور رکن ندیم الرحمن قدوائی، شہر لکھنؤ کے مشہور مسلم لیگی، احسان الرحمن قدوائی کے صاحبزادے تھے۔ لیکن والد کی زندگی ہی میں علی الاعلان قوم پروردوں میں شامل ہو گئے تھے اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے فعال رکن بھی رہ چکے تھے۔ خانہ پڑی کے لئے ایک اردو ماہنامہ ’مرکزی اطلاعات‘ کی طرز پر یہاں سے نکلتا تھا۔ اُس کا نام اطلاعات تھا۔ یہ ماہنامہ کیا تھا؟ پریس نوٹوں کا ایک پلندا تھا، جسے کسی ایڈیٹنگ کے بغیر شائع کر دیا جاتا تھا۔ ابتدائی صورتی اور جزوی تزئینی تبدیلیوں کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ ادبی عنصر کا بھی اضافہ کرنا چاہئے۔ میں نے اپنے چند دوستوں، شمیم کرہانی، فرقت کا کوردی اور امین سلوئی وغیرہ سے یہ دوستانہ فرمائش کی کہ وہ اپنے مضامین و نظمیں بطور عطیہ چھپنے کے لئے دیں۔ رسالہ کا ’اطلاعات‘ نام برابر کھلتا رہتا تھا۔ ایک نام ’نیادور‘ بھی

۲	۶-۵	مارچ، ۱۹۴۷ء
۲	۸-۷	اپریل، ۱۹۴۶ء
۲	۱۰-۹	مئی، ۱۹۴۷ء
۲	۱۲-۱۱	جون، ۱۹۴۷ء
۲	۱۳-۱۲	جولائی، ۱۹۴۷ء
۲	۱۵-۱۶	اگست، ۱۹۴۷ء
۲	۱۷-۱۸	ستمبر، ۱۹۴۷ء
۲	۱۹-۲۰	اکتوبر، ۱۹۴۷ء
۲	۲۱-۲۲	نومبر، ۱۹۴۷ء
۲	۲۳-۲۴	دسمبر، ۱۹۴۷ء
۳	۱-۲	یکم جنوری، ۱۹۴۸ء
۳	۳-۴	فروری، ۱۹۴۸ء
۳	۵-۶	مارچ، ۱۹۴۸ء
۳	۷-۸	اپریل، ۱۹۴۸ء
۳	۹-۱۰	مئی، ۱۹۴۸ء
۳	۱۱-۱۲	جون، ۱۹۴۸ء
۳	۱۳-۱۴	جولائی، ۱۹۴۸ء
۳	۱۵-۱۶	اگست، ۱۹۴۸ء
۳	۱۷-۱۸	ستمبر، ۱۹۴۸ء
۳	۱۹-۲۰	اکتوبر، ۱۹۴۸ء
۳	۲۱-۲۲	نومبر، ۱۹۴۸ء
۳	۲۳-۲۴	دسمبر، ۱۹۴۸ء
۴	۱	یکم جنوری، ۱۹۴۹ء

محترم جناب علی جواد زیدی کی کوششوں سے اطلاعات صوبہ متحدہ کا نام بالآخر تبدیل کر کے یہ جریدہ کس تاریخ اور کس سنہ میں نیا دور بنا، یہ ہنوز پردہ حفا میں ہے۔ البتہ سب سے پہلے جناب ڈاکٹر محمد اظہر مسعود خاں رقمطراز ہیں کہ ”اطلاعات“ کے نام کی تبدیلی کے بعد اپریل، ۱۹۵۵ء کا شمارہ نیا دور کے نام سے شائع ہوا اور

شمارہ یقیناً یکم جنوری، ۱۹۴۶ء کو شائع ہوا تھا، جس پر جلد نمبر ۴ اور شمارہ نمبر ۱ مندرج تھا جس کی تاریخ اجراء، یکم جنوری، ۱۹۴۶ء منسلک گوشوارہ کے بموجب بالکل صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔

جلد نمبر	شمارہ نمبر	تاریخ اجراء
۱	۱	یکم جنوری، ۱۹۴۶ء
۱	۲	فروری، ۱۹۴۶ء
۱	۳	مارچ، ۱۹۴۶ء
۱	۴	اپریل، ۱۹۴۶ء



۱	۵	مئی، ۱۹۴۶ء
۱	۶	جون، ۱۹۴۶ء
۱	۷	جولائی، ۱۹۴۶ء
۱	۸	اگست، ۱۹۴۶ء
۱	۹	ستمبر، ۱۹۴۶ء
۱	۱۰	اکتوبر، ۱۹۴۶ء
۱	۱۱	نومبر، ۱۹۴۶ء
۱	۱۲	دسمبر، ۱۹۴۶ء
۲	۱-۲	یکم جنوری، ۱۹۴۷ء
۲	۳-۴	فروری، ۱۹۴۷ء

ذہن میں آیا۔ نام تبدیل کرنے کی تجویز میں نے ڈائریکٹر کی وساطت سے وزیر اطلاعات، ڈاکٹر سپورٹانڈو کو بھیجی۔ انھوں نے نام پسند کیا اور میرے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے ذرا تامل کے بعد فائل پر لکھ دیا کہ ”اطلاعات“ کے مقابلہ میں ”نیا دور“ بہتر رہے گا۔ اس طرح اس ادبی رسالہ کا نیا دور شروع ہوا اور آج یہ جریدہ اردو کے اہم ترین ماہناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ میں ۱۹۵۷ء کے آغاز میں حکومت ہند کے پریس انفارمیشن بیورو میں منتقل ہو گیا اور ریاستی حکومت سے تعلقات باقی نہ رہے۔“

(نیا دور لکھنؤ، فروری، ۲۰۰۱ء، صفحہ ۷ تا ۹)

’نیا دور‘ کے آغاز سے متعلق یہ امر کہ اس جریدہ کا اجراء کس تاریخ اور کس سنہ میں ہوا تھا؟ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ البتہ نامور محقق، عرفان عباسی صاحب نے ’نیا دور‘ کے نصف صدی نمبر میں اپنے گرانقدر مقالہ ’نیا دور‘ پچاس سال: سرسری جائزہ میں رقمطراز ہیں:

”اس وقت نیا دور کا جون، ۱۹۵۶ء کا شمارہ پیش نظر ہے، جس کے سرورق جلد ۱۱، نمبر ۶ درج ہے۔ اس اندراج کے مطابق نیا دور کا سال (اشاعت) یقینی طور پر ۱۹۴۶ء قرار پاتا ہے۔ اسی زمانہ میں صوبائی حکومت کا ایک ۱۵ روزہ ادبی رسالہ پبلیکیشن بیورو، محکمہ اطلاعات کی نگرانی میں ہر ماہ کی پہلی اور ۱۵ تاریخ کو ”اطلاعات صوبہ متحدہ“ کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ اطلاعات، جنوری ۱۹۴۹ء کے پہلے شمارہ، پر جلد ۴ اور نمبر ۱ درج ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جریدہ کا اجراء بھی ۱۹۴۶ء میں ہی ہوا تھا۔“

(نیا دور مارچ تا مئی، ۱۹۹۵ء، صفحہ ۸۹-۸۸)

اس متذکرہ اقتباس کو دوبارہ غور سے پڑھا جائے تو یہ دونوں رسالے یعنی ’اطلاعات صوبہ متحدہ‘ کا برسوں بعد نام تبدیل کر کے اُسے ’نیا دور‘ بنایا گیا تو جلد نمبر اور شمارہ نمبر تبدیل نہیں کیا گیا یعنی ’اطلاعات صوبہ متحدہ‘ اور ’نیا دور‘ کی تاریخ اور سنہ اجراء حتمی طور پر یکساں ہی برقرار رہ گئیں۔ تاہم ’اطلاعات صوبہ متحدہ‘ کا پہلا

تب سے آج تک اسی نام سے شائع ہو رہا ہے۔ بالفاظ دیگر، 'نیادور' کا پہلا شمارہ زیدی صاحب کی ادارت میں ہی اپریل، ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔

(نیادور، نومبر، دسمبر، ۲۰۰۵ء، علی جواد زیدی، نمبر، صفحہ ۲۶) ماہنامہ 'نیادور' کی اشاعت کا آغاز اپریل، ۱۹۵۵ء سے ہوا تھا، یہ غلط اس وجہ سے بھی ہے کہ ہندوستان کے اخبارات سے متعلق حکومت ہند کے رجسٹرار کی شائع کردہ درج ذیل رپورٹ میں 'نیادور' کا سنہ اشاعت ۱۹۵۱ء مندرج ہے۔ اس کے علاوہ علی جواد زیدی صاحب کی ہی ادارت میں 'نیادور' کا آزادی نمبر اگست، ۱۹۵۶ء میں جب شائع ہوا تو اس پر جلد نمبر ۲ کے بجائے جلد نمبر ۱۱ اور شمارہ نمبر ۸ مندرج ہے۔ اس بنیاد پر نیادور کا اپریل، ۱۹۵۵ء کی اولین اشاعت خود یہ خود مشتبه اور غلط ثابت ہو جاتی ہے۔

محترم جناب علی جواد زیدی صاحب کے اتر پردیش محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، لکھنؤ سے جنوری ۱۹۵۷ء کو اپنی ملازمت سے مرکزی حکومت میں منتقلی کے بعد نیادور کے ایڈیٹر جناب مولوی فرحت اللہ انصاری مقرر ہوئے اور اس کے اگلے ہی ماہ فروری ۱۹۵۷ء میں موصوف نے ماہنامہ نیادور لکھنؤ کا جو شمارہ شائع کیا، وہ 'جمہوریت نمبر' تھا، جس پر جلد نمبر ۱۲ اور شمارہ نمبر ۲ مندرج ہے۔ جناب فرحت صاحب نے اپنے ادارے کے تحت رقمطراز ہیں:

”زیدی صاحب (علی جواد زیدی، جو جنوری، ۱۹۵۷ء تک ایڈیٹر تھے) نیادور کے اُس وقت بھی ایڈیٹر تھے، جب اُن کا نام زینت دہ نیادور نہ تھا، وہ اُس وقت بھی نیادور کے سرپرست تھے، جب فائلوں کے انبار میں دبے رہتے تھے۔۔۔ نیادور جو کچھ بھی ہے، وہ انہیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔“

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ متذکرہ ماہنامہ 'اطلاعات' صوبہ متحدہ کے گوشوارہ کے ساتھ 'نیادور' کے جلد نمبر ۱۲، شمارہ ۲ سے پچھلے مہینوں میں

شائع ہونے والی جلدوں اور شماروں کا شمار کیا جائے تو یہ سلسلہ ۱۵ روزہ اطلاعات صوبہ متحدہ کی جلد اول کے شمارہ نمبر ۱ تک پہنچتا ہے، جو درج ذیل گوشوارہ سے بالکل صحیح ثابت ہو جاتا ہے:

۱۵ / اگست، ۱۹۴۸ء	جلد ۳	نمبر ۸
۱۵ / اگست، ۱۹۵۳ء	جلد ۸	نمبر ۸
۱۵ / اگست، ۱۹۴۹ء	جلد ۴	نمبر ۸
۱۵ / اگست، ۱۹۵۴ء	جلد ۹	نمبر ۸
۱۵ / اگست، ۱۹۵۰ء	جلد ۵	نمبر ۸
۱۵ / اگست، ۱۹۵۵ء	جلد ۱۰	نمبر ۸
۱۵ / اگست، ۱۹۵۱ء	جلد ۶	نمبر ۸
۱۵ / اگست، ۱۹۵۶ء	جلد ۱۱	نمبر ۸
۱۵ / اگست، ۱۹۵۲ء	جلد ۷	نمبر ۸
۱۵ / اگست، ۱۹۵۷ء	جلد ۱۲	نمبر ۸

اس اعتبار سے ممتاز و معروف محقق جناب عرفان عباسی صاحب کا یہ تحریر کرنا یقیناً بالکل صحیح اور حق بجانب ہے کہ ”ماہنامہ نیادور لکھنؤ کا جون، ۱۹۵۶ء کا شمارہ پیش نظر ہے، جس کے سرورق پر جلد نمبر ۱۱ اور شمارہ نمبر ۶ درج ہے۔ اس اندراج کے مطابق نیادور کا سال اشاعت یقینی طور پر ۱۹۴۶ء قرار پاتا ہے۔۔۔“

’اطلاعات‘ جنوری ۱۹۴۹ء کا پہلا شمارہ، جس پر جلد نمبر ۴ اور شمارہ نمبر ۱ درج ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جریدہ کا اجراء بھی (کیم جنوری) ۱۹۴۶ء میں ہی ہوا تھا۔“ (نیادور لکھنؤ، نصف صدی نمبر، صفحہ ۸۹-۸۸)

مزید برآں 'اطلاعات' اور 'نیادور' کے مدیر، جناب صباح الدین عمر صاحب کے انتقال کے بعد اتر پردیش اردو اکادمی کے دو ماہی جریدہ 'اکادمی لکھنؤ کے "صبح الدین عمر نمبر" کے پہلے ہی مضمون میں علی جواد زیدی صاحب رقمطراز ہیں کہ "محکمہ اطلاعات سے ایک مخصوص ہفت روزہ اردو میں بھی نکالا گیا۔ غالباً "جنگ کی خبریں" یا "دیش پکار" تھا۔ اس کی ادارت صباح الدین عمر صاحب کے سپرد ہوئی۔ اس میں جنگ

کی خبروں پر توجہ تو دی ہی جاتی تھی۔ لیکن کچھ نظمتیں اور غزلیں وغیرہ بھی دے دی جاتی تھیں۔“

(دوماہی اکادمی صباح الدین عمر نمبر، ایڈیٹر شید رضوی، صفحہ ۱۵) علی جواد زیدی صاحب اپنی متذکرہ عبارت کے آغاز میں ہی غالباً لکھ کر کے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ان دونوں اخبارات کی اشاعت قطعی طور پر منقطع اور مشتبہ ہو جاتی ہے۔

یاد رہے کہ صوبہ متحدہ کے انگریز گورنر، سر ہارکورت بٹلر لکھنؤ کی دکھتی سے اس قدر مسحور ہوئے اور سیاسی ماحول نے انہیں اپنی جانب اتنا کھینچا کہ انہوں نے اپنا دارالحکومت ۱۹۲۱ء میں الہ باد سے رفتہ رفتہ لکھنؤ منتقل کر لیا۔ اب ایوان گورنر، ایوان حکومت اور ایوان قانون ساز لکھنؤ میں ہیں۔ الہ باد میں صرف ہائی کورٹ، اکاؤنٹینٹ جنرل، کے دفاتر، پبلک سروس کمیشن اور بعض دیگر محکمہ جاتی دفاتر مثلاً تعلیمات پولس وغیرہ کے دفاتر رہ گئے ہیں۔ بورڈ آف ریونیو کا عدالتی شعبہ الہ باد میں اور انتظامی شعبہ لکھنؤ میں ہے۔ سر بٹلر نے ہی، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، صوبہ متحدہ کا نام 'یونائٹڈ پرائونسس (یو پی)' رکھا تھا، جو ۲۶ جنوری، ۱۹۵۰ء کو یوم جمہوریہ کے موقع پر ہمارا ملک ہندوستان جمہوریہ ہند بن گیا اور ہماری ریاست اتر پردیش کے نام سے موسوم کی گئی۔ یہی وہ سنہری موقع تھا، جب ہمارے محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ سے جاری ہونے والے اردو ماہنامہ اطلاعات صوبہ متحدہ یا نیادور کا نام تبدیل کر کے 'اتر پردیش رکھ دیا گیا۔ اسی طرح ہندی ماہنامہ سماچار اور ماہنامہ ترپٹھگہ کا نام تبدیل کر کے 'اتر پردیش رکھ دیا گیا، جو آج تک جاری ہے۔ اسی طرح انگریزی ماہنامہ انفارمیشن کا نام بدل کر اتر پردیش رکھ دیا گیا، جس کے مدیر صباح الدین صاحب مقرر رہے۔ لیکن اردو ماہنامہ اتر پردیش اور انگریزی ماہنامہ اتر پردیش ہمیشہ کے لئے معرض التوا میں پڑ گئے۔

□□□



فضل الرحمن اصلاحی

دارالمصنفین، شبلی، اعظم گڑھ

موبائل: 9616349240

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد بحیثیت ادارہ نگار

پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے بلاشبہ ایک بلند پایہ شاعر اور بین الاقوامی ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے بیحد مقبولیت اور شہرت دوام حاصل کی، اسی طرح سب جانتے ہیں کہ وہ ایک اچھے اور قادر القلم نثر نگار بھی تھے، اُن کے نثری اکتسابات بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد پر اُن کا تحقیقی مقالہ اس پر شاہد عدل ہے، مگر بصد افسوس مرحوم کی دوسری حیثیتیں اُن کی گراں پلہ نثر نگاری کے لیے حجاب بن کر رہ گئیں، اقبال سہیل مرحوم کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا رہا، اُن کو بھی دنیا نے ایک بلند پایہ اور برجستہ گو شاعر کی حیثیت سے زیادہ جانا پہچانا، اور اُنکی دل کش نثر نگاری دب کر رہ گئی، چنانچہ جب مرحوم کی ”سیرت شبلی“ راقم کی تدوین و تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی تو ریاض الرحمن شیروانی نے کانفرنس گزٹ علی گڑھ میں اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

”ہم نثر نگار اقبال سہیل سے واقف نہیں

تھے، اب جو زیر تبصرہ کتاب پڑھی تو اُنکی شاعری

میں بھی مزانہ رہا“۔ (شمارہ فروری ۲۰۱۶ء)

بلاشبہ ملک زادہ کی شخصیت اور اُن کے متنوع کمالات، بجا طور پر اس کے مستحق ہیں کہ اس کو جامعات ہند میں ریسرچ و تحقیق کا مستقل موضوع بنایا جائے، تاکہ ہماری ادبی تاریخ میں مرحوم کو قدر واقعی مستحق مقام دیا جاسکے۔ راقم الحروف نے پیش نظر تحریر میں ملک زادہ مرحوم کی نثر نگاری کا اجمالی جائزہ لینے کی ایک کوشش کی ہے، مرحوم ڈاکٹر ملک زادہ رہتی زندگی ماہنامہ ”امکان“ لکھنؤ کے ادارے لکھتے رہے، جو اپنے ظاہری

و معنوی محاسن کے اعتبار سے مرحوم کی نثر کے اعلیٰ نمونے ہیں، مثلاً مرحوم ایام حج کی مناسبت سے دسمبر ۲۰۰۶ء جنوری ۲۰۰۷ء کے شمارے میں خطبہ حجۃ الوداع کے موضوع پر ادارے لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”جس وقت امکان کا یہ شمارہ آپ کے

ہاتھوں میں ہوگا، دنیا کے مختلف ممالک کے

مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد فریضہ حج ادا کر رہی یا

کر چکی ہوگی، صدیوں پہلے نبی کریم اپنے آخری حج

کے موقع پر مسلمانوں کو مخاطب کر کے ایک خطبہ دیا

تھا، جو ”خطبہ حجۃ الوداع“ کے نام سے معروف

ہے، یہ خطبہ جو تمام عالم انسانیت کے لیے ایک

منشور اعظم کی حیثیت رکھتا ہے، اسی کو میں اگلے

صفحات پر بطور ادارے میں پیش کرنے کا شرف

حاصل کر رہا ہوں۔ لوگو! ڈرتے رہو اپنے اللہ

سے، ضمن میں بیویوں کے کہ اللہ کے نام کی ذمہ

داری سے بیوی بنایا ہے تم نے انھیں، حق تمہارا ہے

ان پر تو بس اتنا ہے، بستر تو پر تمہارے کوئی غیر

محرم وہ آنے نہ دیں، جو وہ ایسا کریں، غیر تکلیف دہ

مار مارو انھیں اور تم پر یہ حق عورتوں کا بھی ہے، کھانا

دو، کپڑا دو، ان کو مقدر بھر۔“

عصر حاضر میں اکثر ملک اور بیرون ملک جو مہتمم

بالشان سیمینار اور مجالس مباحثہ کا انعقاد ہوتا رہتا ہے،

بصد حسرت! اُن کے منتظمین کے سامنے کوئی متعین ہدف

یا ٹھوس مقصد نہ ہونے کے باعث عموماً یہ سب بے روح

اور ”نشستن و گفتن و برخواستن“ کا مصداق رہتے ہیں،

اور ان کا کوئی بھی خاطر خواہ مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ہے، ڈاکٹر ملک زادہ مرحوم ایسی ذہنیت پر مثبت انداز میں تنقید کرتے ہوئے ایک ادارے میں لکھتے ہیں:

”چند برائے نام مستثنیات کو اگر نظر انداز

کر دیا جائے تو ملک کے مرکزی شہروں میں ہونے

والے مذاکرات کا موضوع وہ شعراء اور ادباء ہیں جن

پر ہمارے قلم کاروں نے بہت کچھ پہلے ہی لکھ رکھا

ہے، نتیجہ میں جب ان پر کوئی نیا مقالہ لکھا جاتا ہے تو

عموماً پہلے لکھے گئے مقالات کی بازگشت سنائی دیتی

ہے، اور مقالہ نگار ماضی میں لکھے گئے مقالات کے

مرکزی تصورات کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے،

اور کوئی نیا منظر نامہ اُبھر کر سامنے نہیں آتا“۔ اس کی

چند سطروں کے بعد پھر رقمطراز ہیں: ”سیمیناروں میں

ایک دوسری مجبوری سامعین کے لیے یہ بھی ہے کہ

وقت کی کمی یا موضوع کی طوالت کے باعث دو ایک

مقالوں کے بعد صدر مجلس کو یہ حکم صادر کرنا پڑتا ہے کہ

مقالہ نگار حضرات کا جو ”بامعنی اور پرمغز دور“ ابتدا میں

چلا تھا، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے“۔ (بحوالہ سابق)

راقم کے نزدیک اُردو کے مسئلہ میں اکثر لوگ

افراط و تفریط کا شکار ہو کر راہ اعتدال سے ہٹ جاتے

ہیں، ہم نے حبان اُردو کے لبادہ میں ایسے لوگ کثرت

سے دیکھے ہیں، جن کی روزی روٹی اگرچہ اُردو زبان

سے وابستہ ہے، لیکن بایں ہمہ وہ خود اپنے بچوں کو انگلش

میڈیم اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، علاوہ ازیں یہ کتنے

عیب کی بات ہے کہ ایسے لوگ اُردو کے فروغ کے لیے

ایک اردو کا اخبار یا رسالہ خرید کر نہیں پڑھ سکتے، اور ”مفت خوری“ کے عادی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایسے نام نہاد مجاہدانہ اردو کے غیر ذمہ دارانہ رویہ سے اردو کے فروغ کو غیر معمولی نقصان پہنچ رہا ہے، سچ بتائیے! کیا ہم اس کے لیے خود قصور وار نہیں ہیں؟ جہاں تک اردو کے تئیں حکومتی رویہ کی بات ہے، تو اس پر تو صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

غالب یہ کرم کر کے اردو پہ ستم کیوں ہو

پروفیسر ملک زادہ مرحوم بلاشبہ اردو کے شیدائی تھے، حالانکہ اُن کو انگریزی زبان میں بھی یدِ طولی حاصل تھا، اور ایک عرصہ دراز تک وہ مختلف تعلیمی اداروں میں انگریزی زبان و ادب کی تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، مگر بایں ہمہ مرحوم نے جس اخلاص و لگن اور جس فنائیت کے ساتھ قافلہ اردو کی حُدی خوانی میں قائدانہ رول ادا کیا، وہ ہماری ادبی تاریخ میں یادگار رہے گا چنانچہ اسی خصوص میں اُن کا درج ذیل ادارہ یعنی ”خدا ہماری خوش فہمیوں کو سلامت رکھے“ ملاحظہ فرمائیں:

”ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ اُردو

بحیثیت زبان آزادی کے بعد روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے، الفاظ اپنے معنی بدل رہے ہیں، تلفظ غیر معتبر ہوتا جا رہا ہے، اردو تقریبات اور مذہبی تقریبات کے ہینر اردو کے بجائے دوسری زبانوں کے رسم الخط میں لکھے جا رہے ہیں، اور ادب قبرستانوں میں بھی اردو رسم الخط میں لکھے ہوئے ”لوح مزاز“ بھی شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں، اور وہ دن دور نہیں ہے جب ہماری نئی نسل کے لیے اردو رسم خط ایک نامانوس سوالیہ نشان میں تبدیل ہو جائے، اور ہمارے بچے علوم جدیدہ ہی نہیں بلکہ معقولات اور منقولات بھی دوسرے رسم خط میں پڑھ کر اردو کو رفتہ رفتہ بھول جائیں“

واقعہ یہ ہے کہ اُردو کا زکے لیے اُنکی تحریریں خون جگر سے لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ آزادی وطن کے بعد اُردو زبان کی پیتا خود اُن ہی کے قلم سے

ملاحظہ فرمائیں :

”آزادی کے بعد ترقی پر دہلیش اور دہلی سے ملحقہ علاقوں کو اُردو کا علاقہ تسلیم کرانے کے لیے انجمن ترقی اردو کی سربراہی میں ۲۲ لاکھ دستخطوں کا ایک محضر عوامی جذب و شوق نے تیار کیا تھا، جسے ذاکر حسین صاحب نے صدر جمہوریہ ہند کو پیش کیا تھا، مگر تفصیلات میں گئے بغیر اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا، اور ہمارے سہل پسند دانشور یہ کہنے لگے حکومت سے مراعات طلب کرنے کے بجائے ہمیں اپنے بچوں کو خود اردو پڑھانا چاہئے، اور کسی احتجاجی رویہ کو اختیار کرنے کے بجائے اپنے مطالبات حکومتوں کے سامنے پیش کرنے چاہیں، جن کے گھروں میں بجلی پانی نہیں آتا تھا تو وہ سڑکوں پر احتجاج کے لیے نکل آتے تھے، مگر اردو کے لیے یہ کبھی گھروں سے باہر نہیں نکلے، اور اگر کچھ سر پھرے نکل بھی پڑتے تھے تو یہ ان کی مخالفت میں آوازیں اٹھا کر حکومتوں کے منظور نظر بن کر پدم شری اور پدم بھوشن کے اعزازات سے سرفراز ہوتے تھے، اور جمہوریت میں اردو کی ہر عوامی تحریک کو نقصان پہنچاتے رہے، یہ سہل پسند دانشور یہ بھی بھول گئے کہ اردو پڑھانے کا مطالبہ اردو والوں کی اس اکثریت یعنی مسلمانوں سے کیا جا رہا ہے، جس نے اپنے سات سو سالہ ہندوستانی دور اقتدار میں اپنی مذہبی زبان عربی بھی اپنے بچوں کو نہیں پڑھائی، اور جو سرکاری زبان تھی اسی کو پڑھاتے رہے، اور آج بھی ابتدائی اور ثانوی سطح پر ملک کی سرکاری زبان کو پڑھا رہے ہیں۔“

(امکان جولائی اگست ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر افضل حسین نے اپنی کتاب ”اردو صحافت آزادی کے بعد“ میں مولانا آزاد پر کچھ سطحی قسم کے اعتراضات کئے تھے پروفیسر ملک زادہ ان اعتراضات کا مسکت جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مقالہ نگار کی رائے میں مولانا جھوٹے ہیں اور تمام محققین سچے ہیں۔ مولانا آزاد نے اپنے رسالہ ”الہلال“ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۳ء میں ایک گم نام خط کے جواب میں لکھا تھا ”آپ پوچھتے ہیں کہ مغرب و مشرق کے کس دارالعلوم میں ادنیٰ یا اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، گزارش ہے کہ الحمد للہ کسی میں نہیں، البتہ رب المشرقین و رب المشرقین کی اس درس گاہ سے فیض یاب ہوں۔ جب اس درس گاہ الہی کا دروازہ مجھ پر کھل گیا تمام کاغذ کی سندیں دینے والے دارالعلوم میں بے نیاز ہو گیا ہوں۔“

پروفیسر ملک زادہ مرحوم کے ادارے بنیادی طور سے اردو شعر و ادب نیز اردو زبان کے فروغ کے لئے وقف تھے وہ بڑے ہی جامع انداز میں اردو کے مسائل پر قلم اٹھاتے اور ان کے حل کے لئے مختلف طرح کی تدابیر سوچتے تھے۔

ملک زادہ منظور بعض دفعہ منظوم ادارہ بھی تحریر فرماتے تھے مثلاً ذیل میں امکان فردی و مارچ ۲۰۰۷ء کا منظوم ادارہ یہ ملاحظہ فرمائیں۔ جو آج کے حالات کی بڑی عمدہ تصویر کشی کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

صحیفہ نو برنگ قول و قرار اُتر اتو میں نے دیکھا
فریب وعدہ وہی تھا، جو بار بار اُتر اتو میں نے دیکھا
تمام جھوٹی تسلیوں کی جوتھیں تو بے رنگ سلوٹیں تھیں
جب اسکے چہرے سے غاڑا اعتبار اُتر اتو میں نے دیکھا
مرے فریب نظر نے اس کو بلند قامت بنا دیا تھا
وہ اتفاقاً جو بام سے ایک بار اُتر اتو میں نے دیکھا
تمام میکش تھے پیاسے پیاسے بس ایک ساتی بہک رہا تھا
شب گزشتہ کا صبح دم جب ہمارا اُتر اتو میں نے دیکھا

مجموعی اعتبار سے پروفیسر ملک زادہ کے اداروں کو افادہ عام کی خاطر شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔

□□□

◆ نیادور جون ۲۰۱۸ء ۱۷



غزل

کس سفر پر ہیں رواں ہم لوگو، وقت آہٹ نہ صدا چاہتا ہے
کوئی منزل ہے نہ قدموں کے نشان راستہ ختم ہوا چاہتا ہے

کوئی بتلائے کہ یہ زیست کا لفظ، ہم سے بے لفظ سے کیا چاہتا ہے
رات پلکوں پہ رکا چاہتی ہے خواب آنکھوں سے بہا چاہتا ہے

اپنے ہونے کی بشارت یوں بھی دنیا والوں کو دیا چاہتا ہوں
خواہ آواز ہو، سناٹا ہو واہمہ کوئی قبا چاہتا ہے

دید بے دید سے حیران کیا ہجر کے کرب سے تڑپا ڈالا
آنکھ پیاسی تھی سواٹک اس کی غذا، دل کہ مجرم ہے سزا چاہتا ہے

یاس گزری تھی بگولے کی طرح دھندستوں سے نہ اتری برسوں
آس آئی دے قدموں شاید رنگ خوشبو میں گھلا چاہتا ہے

جس اور جہل کے اس پردے میں ہے کوئی آنکھ جو روزن کردے
برگ ادراک تڑپنے کے لیے ایک تھوڑی سی ہوا چاہتا ہے

شہپر رسول

صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

موبائل: 9891721184



غزل

ہر موجِ غم کو ہم نے کنارہ بنا لیا
تیرے غموں کو ہم نے سہارا بنا لیا

جو سانپ بن کے ڈستے رہے ہیں ہمیں سدا
ان کو بھی ہم نے اپنا دلارا بنا لیا

میرا قصور ہے تمہیں اپنا سمجھ لیا
دشمن کو دیکھو جان سے پیارا بنا لیا

مطلب پرست تم رہے، کیا اس کا غم کریں
ہم نے تو تم کو آنکھ کا تارا بنا لیا

ہو جس کے ساتھ غیبی مدد اس کو کیا خطر
موج بلا کو اس نے کنارہ بنا لیا

آصفہ زامانی

چیئر پرسن اردو اکادمی، A-4/83، ویشال کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ

موبائل: 9621914069



اقبال مجید

سورج فارس، مکان نمبر ۲، انیر پورٹ روڈ، بھوپال
موبائل: 9893764746

اپنے اپنے طوطے

پولپے منہ، سفید بالوں اور جھکی کمر والی دو بڑھیاں پاس پاس رہتی تھیں، ایک دیوار کے ادھر اور دوسری دیوار کے ادھر۔ ایک کا نام گلابو تھا اور دوسری کا شتابو۔ بیچ کی دیوار اونچی نہ تھی زمیں پر بالٹی اوندھا کر دیوار کے سہارے کھڑے ہونے پر دوسری طرف گھر میں کیا ہو رہا ہے یہ دیکھا جانا کوئی دشوار نہ تھا۔ کون آیا، کون گیا، گلابو کیا کر رہی ہے ان سب باتوں کی خبر ایک دوسرے کو رہا کرتی تھی۔

گلابو کے پاس ایک زنگ خوردہ پنجرہ تھا جس میں نہ جانے کب سے ایک طوطا پلا ہوا تھا، دن بھر بنی جی بھبھو، پکارتا یا سیٹیاں بجاتا مگر بولتا صاف تھا۔ شتابو کے پاس ایک شریف انفس مینا تھی جس کو بڑھیا دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے جلی کٹی سنایا کرتی مگر مینا ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی مگر جیسے ہی بڑھیا گھر سے باہر نکلتی مینا پنجرے سے آواز مارتی ”جا رہی ہو۔“ بڑھیا جواب دیتی ”چل ہٹ مر دار۔“

گھوڑوں کا کاروبار کرنے والے ایک رئیس کی بیوی نے دونوں بڑھیوں کو اپنے میاں کے لقمہ و دق اصطلح کے ایک کمرے میں درمیان میں دیوار کھینچ کر اس لئے ڈال لیا تھا کہ وقت بے وقت کام آئیں گی۔ بڑھیاں گھاگ تھیں، جانتی تھیں کہ ڈیوڑھیوں کی شادا بی دھیرے دھیرے مرجھا رہی ہے اس لئے تن بہ نقدیر جو حصے میں آ رہا تھا اُسی پر شکر ادا کرتیں۔

کچھ دنوں میں شتابو کو یہ سن گئی کہ گلابو کے گھر میں چلتی پڑھ اور بدنام زمانہ بی جملو کا آنا جاناروز

کا معمول بن گیا ہے۔ بی جملو معمولی چیز نہ تھیں، آسمان میں تنگی لگاتی تھیں۔ ایک دن جب جملو کے آنے کی آہٹ ملی تو شتابو جھٹ دیوار سے بالٹی اوندھی ٹکا کر کھڑی ہو گئیں اور اُس پار کا بھید لینے لگیں، دیوار کے پاس ہی کھاٹ بچھائے گلابو اور جملو بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

گلابو: اے بہن جملو کوئی راستہ بتاؤ کہ ہمارا بھی مقدر پلٹے اور اچھے دن آئیں، کہا تھا سوچ کر بتاؤں گی۔ بھلا کچھ سوچا؟“

جملو: سوچا تو ہے۔

گلابو: کیا سوچا؟ بتاؤ نا۔

جملو: تمہارے پاس ایک طوطا ہے۔

گلابو: طوطا؟ ہے تو مگر وہ کس کام کا؟

جملو: وہی کہہ رہی ہوں اُسے کام پر لگاؤ۔

گلابو: زیادہ سے زیادہ بنی جی بھبھو سکھا سکتی

ہوں، سو وہ دن بھر رشتا رہتا ہے۔

لمبی بات چیت کے بعد جملو اور گلابو میں یہ

طے پایا کہ بہت سوچ سمجھ کر طوطے کو ایسے سبق سکھائیں

گی جن سے چار پیسے کمائے جاسکیں۔ وہ لوگ جو

ڈوبتے میں تنکے کو بھی سہارا سمجھ کر پکڑ لیا کرتے ہیں،

ایسے لوگ طوطے کو ٹیپی طاقت کا مالک سمجھے لگیں گے۔

مراد میں مانگیں گے، چڑھاوے چڑھائیں گے، اندھا

کیا چاہے دو آنکھیں شتابو جملو پر صدقے قربان

ہوگئی۔ تب جملو نے شرط رکھی۔ جب طوطے کو سکھائے

سبق کچھ پھل دینا شروع کر دیں تو ہر روپے پر بیس

پیسے کی حقدار بی جملو بھی ہو جایا کریں گی۔ یہ سن کر شتابو کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ دن رات گلابو کے آنگن کی طرف کان لگے رہے لیکن بی جملو اندر کے کمرے میں طوطے کو جو ریاض کراتیں اس کا کچھ پتہ نہ چلتا، کچھ ہی عرصے میں گلابو کے یہاں کیا ہو رہا ہے اس کا پتا لگانے کے لئے شتابو آخر بے صبری سے اس کے گھر پہنچ ہی گئیں، جیسے ہی انہوں نے ٹوٹے پھوٹے برآمدے کی طرف بڑھنا شروع کیا تو ایک دھتی میں لٹکے پنجرے کی طرف سے آواز آئی۔

”آؤ خوش نصیب آؤ“ شتابو حیران پنجرے

کے پاس جا کر بت بنی کھڑی رہ گئیں کہ طوطا گردن کے

بال پھلا کر بولا۔

”مانگو۔ ملے گا۔ مانگو ملے گا“

شتابو نے دیکھا کہ گلابو کے بدن کا لباس بھی

طوطے جیسا ہو گیا ہے یعنی سبز جمپر پر لال دوپٹہ۔ کچھ

دنوں بعد گلابو کے گھر سے لوبان کی خوشبو آنا شروع

ہوگئی۔ طوطے کا پنجرہ نیلے کے ہاروں سے ڈھکنے لگا۔

اب طوطے کو نیا سبق سکھایا گیا تھا۔

”بٹھئے۔ میاں مراد پوری کریں گے۔“ یا پھر

طوطا آنے والوں کو ڈانٹتا۔

”واپس جاؤ، کچھ نہیں ملنے کا“

شتابو نے شدت سے محسوس کیا کہ گلابو کا لباس

یہ نہیں اس کی آواز بھی طوطے جیسی کڑکیلی اور پتلی سی

نکلنے لگی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے گھر کا دروازہ

بھی طوطے کے رنگ کا رنگوا لیا تھا جبکہ اصطلح کے مالک

چڑھاوے کے لئے سیل بند کیسے کمپنی کی طرف سے رکھے جائیں گے۔

جمالو: لیکن حضور میری محنت۔

اسلمعیل: کیسی محنت؟

جمالو: میں نے ہی تو طوطے کو سکھایا ہے

حضور۔

اسلمعیل: تم کو معلوم ہے کمپنی اب تک پانچ لاکھ

روپیہ صرف طوطے بابا کی پہلی پریز پر خرچ کر چکی ہے۔

آئندہ سے تمہاری کارکردگی کو دیکھ کر تنخواہ دی جائے گی

ورنہ کسی دوسرے ٹریڈر کو رکھ لیا جائے گا۔ ہزار روپے تم

مجھ سے لے لو، اسلمعیل نے نوٹ پکڑا کر بی جمالو کو

کمرے سے رخصت کر دیا، شوہر کو اکیلا پا کر بیگم خنک

اداسی سے بولی۔

بیگم خنک: اب تو تمہیں طوطے کے سوا کسی چیز

کا ہوش نہیں، نہ وقت پر رکھتے ہو نہ سوتے ہو، ڈائریٹرز

اور بلڈ پریشر کا موڈی مرض لے کر بیٹھ گئے ہو، بات

بات پر غصہ کرتے ہو، میرے اوپر ہاتھ اٹھانے لگے

ہو۔

اسلمعیل: گلابو شتا بو کو جگہ میں نے اپنے اصطلب

میں دی۔ طوطے اور اس کی مالکن کی آباد کاری میرے

ہاتھوں ہوئی اور جب لوگوں نے دیکھا کہ طوطا ایک

فکسال میں بدل سکتا ہے تو وہ اس کو مجھ سے چھین لینے

کے درپے ہو گئے۔ خزانہ لے جانا آسان ہے مگر خزانے

کی حفاظت جان پر بن آتی ہے۔ طوطے کو ان

جو کھموں سے بچانے میں مجھ پر کیا گزری ہے اب تم کو

کیسے بتاؤں۔ پچاس لاکھ روپے طوطے بابا کی پہلی

کے لئے رکھے جائیں گے۔ میدان کے مغرب میں

زارین کے لئے بینک سے قرض لیکر سرانے بنوانے کا

پروگرام ہے یہ کہہ کر اسلمعیل کمرے سے چلا گیا۔

شتا بونے مہرن کے پاس لینے لیٹے اس کی باپ

کی یہ باتیں سن کر ٹھنڈی سانس لی۔ مہرن بہ ظاہر سوتی

پڑی تھی اس لئے صبح جب اس کا مگلیتر اقتدار عالم اس

مہرن سیانی اور سمجھدار تھی گلابو کے گھر پیسے کی ریل پیل

دیکھ کر وہ حیران تھی۔ ایک دن مہرن کو گلابو مال میں مل

گئی۔ ٹی وی کا جدید ترین ماڈل گلابو نے اسی وقت

خریدا تھا جو پیک کیا جا رہا تھا۔ گلابو جنس اور ٹاپ میں

تھی۔ پیروں میں اٹلی کی قیمتی نوک دار نیل والی سینڈل

تھی۔ مہرن اس کے آگے ملازمہ لگ رہی تھی۔ مہرن کو

دیکھتے ہی اُس نے فریادی۔

”بی بی تمہارے باپ نے میری آمدنی بند

کر دی۔ تھوڑے سے پیسے دیکر طوطے کے حقوق لکھا

پڑھی کر کے اپنے نام لکھوا لئے۔ میں ان پڑھ بڑے

لوگوں کے جھانسنے میں آگئی۔ یہ کہہ کر گلابو چل دی۔

مہرن اس کی چال کو غور سے دیکھتی رہی۔ اونچی ایڑی کی

سینڈلوں نے اس بڑھیا کی جس کا سر قیمتی شیشو سے

دھلکر چمک رہا تھا میں ارستو کر بیسی کی ایسی خوشبو پیدا

کر دی تھی کہ مہرن اسے محسوس کر کے دنگ رہ گئی۔

ایک دن مہرن کچھ بیمار پڑ گئی تو شب باشی کے

لئے اس کے پاس رہنے کے واسطے شتا بو کو گھر بلا لیا

گیا۔ شتا بورات مہرن کے کمرے میں لیٹی تھی برابر کا

کمرہ مہرن کے باپ کا تھا جہاں اس وقت لوگوں کا آنا

جانا لگا ہوا تھا۔ شتا بونے دیکھا کہ اس آؤک جاؤک کے

درمیان بی جما بھی اسلمعیل خنک سے ملنے گئی اس وقت

مہرن سوچتی تھی شتا بونے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔

بیگم خنک کہہ رہی تھیں۔

”جمالو تم اسلمعیل کو اپنا مقدمہ بتاؤ“

جمالو: کیا بتاؤں حضور۔ گلابو اور میرے

درمیان طے ہوا تھا کہ جب طوطے بابا کا کام چل نکلے گا

تو ان پر جو بھی نقد چڑھاوا چڑھے گا اس پر فی روپیہ بیس

پیسہ کمیشن مجھے حق محنت کے طور پر ملے گا مگر ابھی تک

گلابو نے صرف دو سو روپے دیئے ہیں۔ اسلمعیل سنتے

ہی بھڑک اٹھے۔

اسلمعیل: کوئی کمیشن نہیں۔ طوطا اب کمپنی کا

نوکر ہے۔ خاص بڑی کمیٹی بنائی گئی ہے۔ نقد

اسلمعیل خنک نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ ان کی

اجازت کے بغیر کہیں بھی کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ لیکن

دروازے کا رنگ ہی نہیں بدلا گیا تھا بلکہ دروازے کی

چوکھٹ پر ایک بورڈ بھی نصب کیا گیا تھا جس پر لکھا تھا

”طوطا بابا آشرم“ شتا بو کو چھین کیسے ملتا۔ برقع اوڑھ

اسلمعیل خنک کی بیوی سے بھید لینے پہنچ گئی۔ وہاں اس کو

بیگم خنک سے جو کچھ معلوم ہوا اس سے اس پر حیرتوں

کے پہاڑ ٹوٹ پڑے مثلاً یہ کہ دروازے رنگنے اور بورڈ

لگانے کی اجازت خود بیگم خنک نے گلابو کو دی ہے۔ یہ

کہ وہ لاؤڈ تھی لیکن طوطے کی کرامات نے اس کی جھولی

بھرنے کا معجزہ ڈاکٹرنی کے ذریعے سنا دیا ہے، یہ ماجرا

سن کر شتا بو لٹے پیروں گلابو کے گھر گئی تو گھر کا نقشہ ہی

بدلا ہوا پایا۔ برآمدے میں لکڑی کے دو کسادہ تخت بچھے

ہوئے تھے جن پر بے داغ سفید چاندنی اور گاؤ نکلیوں

کا فرش بچھا ہوا تھا۔ کپے آنگن میں زمین برابر کر کے

پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ قلعی کیا ہوا ایک نقش پاندان

جو کم سے کم پانچ کلوتا سنے کے وزن کا رہا ہوگا تخت کے

ایک کونے پر آنے والی بیسوں کی ضیافت کے لئے رکھا

تھا جسے شتا بونے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ بیگم خنک کے

گھر کا ہے۔ شتا بو کی نظر اخبار کے اس اشتہار پر بھی

پڑی جس پر لکھا تھا۔

”مراد مانگنے والے مایوس نہ ہوں، طوطا بابا

سے مانگیں، اصطلب نزد چھاؤنی“۔

شتا بو جب گھر سے باہر جھانک جھانک کر دیکھتی

تو دن بہ دن اسے میدان میں اسکوٹروں موٹر سائیکلوں

اور کاروں کی بھیڑ بڑھتے ہوئے دکھائی دیتی۔ پھر اس

نے دیکھا کہ اسلمعیل خنک کے کارندوں نے سواریوں

سے اُس زمین پر گاڑیاں وغیرہ کھڑی کرنے کا کرایہ لینا

شروع کر دیا۔ بی جمالو کو دھیرے دھیرے یہ اندازہ

ہونے لگا کہ طوطے کی مقبولیت کچھ اتنی بڑھ رہی ہے کہ

شہر کے بڑے لوگوں کے دانت اس پر لگنا شروع

ہو گئے ہیں۔ اسلمعیل کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی تھی۔

سے ملنے آیا تو مہرن نے ساری باتیں اسے بتادیں جسے سن کر اقتدار عالم کو ذرا بھی تعجب نہ ہوا، اس نے مہرن کو سمجھایا کہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اسماعیل طاقت کا بھوکا ہے۔ طوطے کے ذریعے بڑھتی آمدنی پر قبضے کے لئے طاقت کے جس ڈھانچے کی تعمیر کے دوران لہولہان ہونا پڑتا ہے اسماعیل کے لئے اتنا لہولہان ہونا بھی ضروری تھا کہ اس کے مرکز میں وہ پوری طاقت سے خود کو موجود اور محفوظ رکھ سکے۔

اقتدار عالم۔ ایم ایل اے تھا، سیاسی آدمی ہونے کے سبب آنکھیں کھلی رکھتا تھا۔ اپنے ہونے والے سراسر اسماعیل خنک کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ وہ طاقت کا دیوانہ ہے۔ اقتدار کی شروع سے اس بات پر نظر تھی کہ اسماعیل طوطے کو قابل فروخت بنانے کے لئے کتنا بڑا پاور اسٹرکچر دھیرے دھیرے کھڑا کر رہا ہے۔ سیاست میں ہونے کے سبب اقتدار عالم کو یہ بھی معلوم تھا کہ سرکار قبائلیوں کی اصلاحی اور فلاحی اسکیموں کی پشت پناہی کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ ایک دن اُس نے بی شتابو کو مہرن کے سامنے روتے ہوئے دیکھ لیا۔ رونے کی وجہ پوچھی تو وہ بولی ”میاں میری قسمت میں ہی رونا ہے۔ ورنہ میرے پاس بھی ایک مینا ہے، پٹر پٹر بولتی ہے، ایک گلابو کا طوطا ہے کیا قسمت لے کر آیا ہے۔“ یہ سن کر مہرن کے منگیتر کے دل میں ایک بڑا اچھوتا خیال آیا، اس خیال کو اس نے آدمی وادی منتر الیہ کے کچھ دوستوں سے بیان کیا۔ جب بعض لوگوں نے اس کی ہمت افزائی کی تو اُس نے اپنا پلان مہرن سے بیان کیا۔ مہرن بہت گھبرائی، بولی۔

”یہ نہ کرو۔ میرا باپ سمجھے گا کہ تم اس کی مقابلہ آرائی پر اتر آئے ہو۔“

لیکن اقتدار عالم نہیں مانا بی جملو کو بلوا بھیجا۔ وہ آئی تو بڑی رازداری سے پوچھا۔

”جیسے تم نے گلابو کے طوطے کو پڑھا پایا ہے۔ کیا شتابو کی مینا کو بھی پڑھا سکتی ہو؟ بی جملو جلی بھٹی بیٹھی

تھیں، تنک کر بولیں ”اے بیٹا طوطے کو پڑھا کر اس بڑھیا کو کیا ملا جو مینا کو پڑھا کر ملے گا۔ کمائی تو دوسرے کھا رہے ہیں۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو میں تمہیں بیٹنگی کچھ رقم دوں گا اور ماہوار تنخواہ بھی لیکن ہم مینا کو تیار کرنے میں اب نئی ٹیکنالوجی کی مدد بھی لیں گے۔“ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، نئے استادوں کے ساتھ بی جملو بھی مینا کو پڑھانے میں لگ گئیں۔

طوطے کے بھگتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اسماعیل اور اس کے ساتھیوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ طوطے کے ہاؤ بھاؤ میں کچھ نئے اضافے کرنے کے لئے ماہرین کی ایک خاص کمیٹی بنائی گئی جس کی سفارشات کی رو سے طوطے کی شخصیت میں تھوڑی فقیر کی شان پیدا کرنا بازار کی ضرورتوں کے اعتبار سے کافی منفعت بخش بتایا گیا تھا۔ ایسے دو ماہرین تلاش کر لئے گئے جو طوطوں میں روحانی خصوصیات اُبھارنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں خبر آئی کہ طوطا موسیقی کے بعض ٹکڑوں پر حال اور قال کی کیفیت میں مبتلا ہونے لگا ہے۔

ایک خبر تو یہ بھی تھی کہ پرندوں میں Genetic Engineering کے تجربے کرنے والے ڈاکٹروں کے پاس طوطے کو مینے میں تین بار لے جایا جاتا ہے۔ اب طوطا سوالی کا جواب دینے سے پہلے آنکھیں بند کر کے اور گردن آسمان کی طرف اٹھا کر دو پل دیکھتا ہے۔ پھر گردن نیچی کرتا ہے آنکھیں کھولتا ہے اور جواب دیتا ہے ”ملے گا۔ ملے گا“ اس کے بعد کارڈ کی ہوئی آرکسٹرا کی دُھن بجتی ہے۔ یہ عشق عشق ہے عشق عشق اور اس دُھن پر طوطا مجذوب کی طرح اپنے دونو بازو ہوا میں اٹھا کر رقص کرتا ہے، اب وہ کافی بڑے اور خوبصورت پنجرے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

دراصل بنیادی حقوق اور سماجی انصاف کے اداروں کی جن خواتین اراکین سے اقتدار عالم کی دوستی تھی ان کے

ذریعے اقتدار کو مقامی آدمی باسیوں کی بد حالی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس طبقے کے کچھڑے پن، جہالت، روایت پسندی، شراب نوشی، خاندانی تشدد وغیرہ جیسی بدعتوں کی اصلاح کے لئے قدم اٹھانے کی کارگر کوششوں کے لئے اقتدار کے دل میں اس جذبے سے زیادہ کمائی کا راستہ نکالنے کی فکر بھی تھی۔ اس طبقے کے عام لوگوں کے خواب اور محرومیوں کی تفصیلی چھان بین کے اعداد و شمار اقتدار عالم نے حاصل کر لئے تھے۔ مہرن اپنے منگیتر سے چاہتی تھی کہ وہ شتابو کی پنجرے کی مینا کی مدد سے اس آدمی باسی طبقے کی خرابیوں کی اصلاح کا کوئی راستہ نکالے۔ منگیتر اقتدار عالم سیاسی آدمی تھا ایسی سرکاری اسکیموں سے واقفیت اور اُن تک پہنچ بھی رکھتا تھا۔ بعض متعلق لوگوں سے اس نے جب اپنا خیال بیان کیا تو انھیں خاصے امکانات نظر آنے لگے۔ بس پھر کیا تھا اقتدار عالم اپنے چند خاص ساتھیوں کے ساتھ اس پر دھیکٹ میں جٹ گیا۔ شتابو کی سیدھی سادھی پنجرے کی مینا مینا جو گن بن گئی۔ آدمی وادی اپنی کونسی حاجتیں اور مرادیں لے کر آئیں گے اور کیا سوال کریں گے ماہرین نے اس کی کھوج کی اور بی جملو نے مینا جو گن کو اس کے جوابات رٹانے کی مشق کرائی۔ مہرن یہ سب دیکھ رہی تھی، اقتدار عالم نے جب کچھ لوگوں کی ایک مشاورتی کمیٹی بنائی جس کا مشورہ تھا کہ اس کام میں تھوڑا بہت کلیم ڈالنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ بھولا بھالا آدمی وادی دیکھ کر بھونچکا رہ جائے۔ مہرن نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اسکیم کا مطلب پیسہ کمانا نہیں ہونا چاہئے لیکن کسی نے نہیں سنا۔ سوال کرنے سے پہلے مینا کو ایک گانے کی دُھن سنائی جاتی۔ اس گانے کی دُھن پر مینا کو جواب رٹائے گئے تھے۔

موسیقی کے ماہر نے سوالی کے سوال پر نظر کی اس کے مطابق گانے کا انتخاب کیا۔ گانا بجا شروع ہوا۔ آوارہ ہوں۔ یا گردش میں ہوں آسمان کا تارا

ہوں۔ آوارہ ہوں۔

جیسے ہی گانا ختم ہوا، آنے والے سے سوال کرنے کو کہا گیا، سوالی نے سوال پوچھا۔

”میںنا جوگن میری غریبی کب دور ہوگی“ میںانے

جواب دیا۔

”غریبی دور کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں میں چاہتا ہوں“ آدمی گڑگڑایا۔ جواب

ملا۔

”دارو چھوڑ دو۔ غریب نہیں رہو گے“

اگر کسی کو اس طرح کی بات پوچھنا ہوتی کہ وہ

فلاں جگہ لڑکی کا رشتہ کرے یا نہ کرے تو میںنا کو یہ گانا سنایا

جاتا

”انکھیاں ملا کے۔ جیا بھر ماکے چلے نہیں جانا۔

اوہو چلے نہیں جانا“۔ گانسان کرینا فوراً سوال کرتی۔

”قرض دار ہو؟“

”ہاں میں ہزار کا“ آدمی منہ لٹکا کر جواب

دیتا۔

”ادھاری ادا کرو، شادی بعد میں“ میںنا کی

نصیحت سن کر آدمی واپسی حیران رہ جاتا۔ دل پر اثر بھی

کچھ زیادہ ہوتا۔ اگرچہ اس کام میں طوطے والی آمدنی تو

نہ تھی مگر پھر بھی شتابو کے دروازے پر بیٹھ رہنے لگی۔

اتھے سوالوں پر انعام دیئے جانے لگے اور یہ دکھائی

دینے لگا کہ پروجیکٹ شہرت حاصل کر لے گا۔

پھر جب اسماعیل خٹک کو معلوم ہوا کہ اس کا

ہونے والا ایم ایل اے داماد میںنا جوگن کے آشرم کی

چیکے چیکے ترقی کے لئے لگا ہوا ہے تو وہ آگ بگولہ ہو گیا۔

شام کو جب وہ اپنی منگیت سے ملنے آیا تو اسماعیل سگار

جلائے بیٹھا تھا۔ اسی وقت اقتدار عالم اور اپنی بیٹی کو

ساتھ لیا اور اندر کی جانب ایک نو تعمیر کمرے میں لے

گیا اور بولا ”تم دونوں اس بات کو سمجھ لو کہ ہمارا کاروبار

کس قدر سائنسی بنیادوں پر چل رہا ہے، یہ کہہ کر اس

نے دیواروں پر ٹنگے طوطوں کے بدن کے رگ و پٹھے

اور اعضاء کے نقشے جو بھاری تعداد میں ٹنگے ہوئے

تھے دکھائے۔ پھر اس نے بتایا کہ تقریباً ۱۰۰ کے

قریب ماہرین اس پروجیکٹ میں لگے ہیں، طوطے بابا

کو پانچ ہزار کا ایک انجکشن ہر ہفتے لگتا ہے۔ طوطے کے

اندر یادداشت ذہانت اور سمجھداری کو اپنی ضرورت

کے مطابق قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ جو لوگ اس

کام میں سرمایہ لگا رہے ہیں وہ زیادہ تر دوسرے

کاروباروں میں ہمارے ہوئے لوگ ہیں، یہ دیکھ کر کہ

تمہارا کوئی عمل ان کے پیٹ پر لات مار رہا ہے تو تم

راستے سے ہٹا دیئے جاؤ گے۔ طوطے بابا سے عقیدت

کی حالت یہ ہے کہ طوطے بابا پر قیمتی چڑھاوے چڑھ

رہے ہیں، انہیں کہاں رکھا جائے سمجھ میں نہیں آتا۔

بیرونی ممالک سے آنے والے طوطے بابا کے بھگتوں

کے ٹھہرنے اور کھانے کا انتظام ہم نہیں کر پارہے ہیں۔

اگر تم یہ بزنس کرنا چاہو گے تو گھر کے آدمی ہو، ہم تم کو

اجازت دے سکتے ہیں اور جو مدد چاہو وہ بھی، چار پیسے

تم بھی کما لو گے۔ لیکن اس کا منگیتز اقتدار عالم بچی

گولیاں نہیں کھیلتا تھا، خٹکی سے بولا۔

”دن بھر سوئی گھر میں مرو، تب چالیس ہزار

مہینہ کمائو۔ ملائی کوئی اور کھائے تم تل چھٹ کھاؤ۔ مجھے

نہیں چلانا ہے ڈھابا“۔

جب میںنا جوگن کا باقاعدہ آشرم کا افتتاح ہوا تو

پولیس بینڈ بجا، آتش بازی چھڑائی گئی۔ اخباروں میں

پورے صفحے کے اشتہار چھپے، پریس کے نمائندوں کو

ہوٹل میں دارو کے بعد ڈنر دیا گیا۔ پریس نوٹ میں

پورے کام کو سیاسی اور اصلاحی رنگ دیا گیا تھا اور یہ

مقصد بیان کیا گیا تھا کہ میںنا جوگن کی مدد سے آدمی

واسیوں کے پچھڑے پن کی اصلاح کے لئے کچھ نئی

کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ادارے کا کچھ کمانے کا منشاء

نہیں ہے بلکہ معقول آمدنی ہونے پر اسے آدمی

واسیوں کی اصلاح پر ہی خرچ کیا جائے گا، ادارے کا

اعزازی پیٹرن آدمی واپسی منترالنے کی وزیر ریاست کو

بنانے کی تجویز بھی سب سے اوپر تھی۔

طوطے بابا کے کارکنوں کی صفوں میں اس

افتتاح سے ہڑ کمپ مچ گیا، اسماعیل خٹک کو فوراً ہنگامی

میٹنگ بلانی پڑی۔ اس میٹنگ میں اقتدار عالم کے

چھوڑے ہوئے جاسوں بھی موجود تھے انھوں نے آکر

خبر دی کہ ہر ممبر کو میںنا جوگن کے فراڈ کے بارے میں

تفصیل سے بتایا گیا ہے، بحث میں کہا گیا کہ یہ دعویٰ

بالکل جھوٹا ہے کہ آدمی واسیوں کی اصلاح کے لئے یہ

گل کھلایا گیا ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اس پورے

سیاسی کھیل کے پیچھے اسماعیل خٹک کے ہونے والے

داماد اقتدار عالم کھلے خزانے موجود ہیں۔

ایک ممبر جن کا چہرہ رعب دار تھا، چوڑی چھاتی

اور بھاری منچھیں تھیں اور اسماعیل خٹک کی داہنی بھاری

بھر کم کرسی پر بیٹھے تھے اور گلے میں ریوالور کی پیٹی مع

گولیوں کے پڑی تھی، دونوں آنکھیں بند کر کے جملہ

بولتے تھے پھر آنکھیں کھولتے تھے، انھوں نے پہلے

آنکھیں بند کیں اور پھر بولنا شروع کیا۔

اسماعیل اب تک یہ بات سمجھ گئے ہونگے کہ

ہمارے کاروبار میں، ہمارے اپنے کی پہچان کیا ہے؟

اگر نہیں سمجھے ہیں تو ایک بار پھر سمجھ لیں“ یہ کہہ کر انھوں

نے بند آنکھیں کھولیں، ادھر ادھر دیکھا پھر آنکھیں بند

کیں اور بولے ”ہمارا داماد یا ہمارا بیٹا یا بیٹی ہمارے

اپنے نہیں ہیں، ہمارا تو وہ ہے جو اپنی پہچان الگ نہ

رکھے بلکہ جس طرح ہم اسے پہچانا چاہتے ہیں اس

طرح وہ خود کو ہمیں پہچنوائے۔ ہمارا تو صرف وہی ہے جو

ہمارے انگوٹھے کے نیچے رہے، جو ایسا نہیں کر سکتا ہے

وہ ٹریگر پر رکھی ہوئی ہماری انگلی کے نیچے دب سکتا

ہے“۔ پھر اس نے اطمینان سے آنکھیں کھولیں،

اسماعیل کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے کہا۔

”اپنی بیٹی اور اس کے بوائے فرینڈ کو میرے

پاس بھیج دو لیکن ایک ساتھ نہیں الگ الگ۔ لگتا تھا

طوطا بابا آشرم کا ڈائریکٹر وہی تھا۔

میٹنگ ختم ہوئی تو بستر پر آنے کے بعد اسماعیل کو نیند نہیں آئی۔ سویرے بیوی کو منہ دھونے سے پہلے سختی سے ہدایت کی کہ وہ بیٹی کو اپنے مانگے بھیج دے اور اقتدار عالم اس وقت تک یہاں نہیں آئے جب تک وہ اجازت نہ دے۔

اقتدار عالم اور مہرن کو بھاری موچھوں والے سے ملنے کے لئے بلا یا گیا، مگر انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔

مہرن کو نانی کے گھر پہنچ کر سب سے بڑا غم اور غصہ اس بات پر تھا کہ اقتدار عالم اس سے ملنے نہیں آیا۔ وہ اقتدار سے محبت کرتی تھی اور اسے کافی ہاؤس کی ملاقاتوں میں سب کچھ بتا چکی تھی کہ وہ کیا ہے۔ اس نے اقتدار کو فون کیا لیکن شکایت سے پہلے اقتدار نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ مینا جو گن کے پروجیکٹ میں وہ بہت مصروف ہو گیا تھا۔ اسے پنجرے کی مینا کو منڈی میں اتارنے کے لئے کارپوریٹ فکرمیں ڈھلی ہوئی ایک خوبصورت پیشہ ور عورت کی ضرورت تھی جو اسے مل گئی ہے۔ مہرن کو اپنے باپ پر جس نے مہرن کو گھر سے ہٹا دیا تھا حیرت نہ تھی کیونکہ وہ اپنی ماں کو اکثر باپ سے یہ کہہ کر لڑتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔

”طوطا اتنا طاقتور ہو گیا کہ اس کے خوف کے علاوہ کسی کا خوف تمہارے دل میں نہیں رہ گیا۔ پرانی داستانوں کی طرح تمہاری جان اب طوطے کے اندر ہے۔“

کچھ دن خاموشی سے گزر جانے کے بعد کا یہ واقعہ ہے جس کی رپورٹ کہیں نہیں کی گئی۔ رات کے ایک بجے کا عمل رہا ہوگا۔

اقتدار عالم عیسیٰ سے اتر کر ایک نیم روشن گلی میں پیدل داخل ہوا۔ دو لمحوں بعد یکا یک اس کے دائیں اور بائیں دو لمبے تڑنگے مرد اس کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ اقتدار عالم ان دونوں کے بیچ میں چل رہا تھا یکا یک اقتدار عالم کے داہنے کندھے کی

طرف چلنے والا بائیں طرف کے کندھے پر چلنے والے سے بولا۔

”ہمارا وہ ہے جو اپنی شناخت نہ رکھے“
بائیں طرف کے کندھے پر چلنے والے نے فوراً جواب دیا۔

”ہمارا صرف وہ ہے جو صرف ہمارے انگوٹھے کے نیچر ہے۔“

پھر دائیں طرف کے کندھے والے نے بائیں طرف والے کو مخاطب کیا۔

”جو انگوٹھے کے نیچے نہیں رہتا ہم اس کے لئے ٹریگر پر رکھی انگلی دباتے ہیں“ اقتدار عالم بھونچکا کبھی داہنے اور کبھی بائیں دیکھتا لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی اس سے مخاطب ہی نہ تھا وہ تو آپس میں باتیں کر رہے تھے آخر وہ لمبے تڑنگے آدمی یکا یک واپس لوٹ گئے۔ اقتدار عالم کو رات کے سنائے میں یوں خوفزدہ اور حراساں کرنے والی واردات کی رپورٹ کہیں نہیں لکھوائی گئی۔ اس طرح کا سانحہ چند نونوں میں ایک بار نہیں بلکہ کئی بار دہرایا گیا۔ آخری بار اس جملے پر کچھ زیادہ ہی زور دیا گیا۔

”جو ہمارے انگوٹھے کے نیچے نہیں رہتا ہم اس کے لئے بس ٹریگر پر رکھی انگلی دبا دیا کرتے ہیں“

الیکشن اب بہت قریب تھا، اس میں بھی شک نہ تھا کہ اقتدار عالم کی پارٹی کنگ میکر کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ نئے حالات کو دیکھتے ہوئے برسر اقتدار پارٹی خود کے تحفظ کے لئے بڑی خاموشی سے نئے عہد و پیمان اور نئی وفاداریاں قائم کر رہی تھی مگر اخبارات کی انکلوں کے باوجود وہ گہرا ازبختی جا رہی تھیں۔

مہرن پہروں سوچنے پر بھی نہیں سمجھ پارہی تھی کہ وہ کونسی طاقت تھی جس نے طوطے جیسی Love Bird کو بوٹیاں نوچنے والے خونخوار گدھ میں تبدیل کر دیا ہے تو کیا شتا بو کے چھوٹے سے پنجرے والی صابر اور شاکر مینا کے ساتھ بھی یہی ہونے جا رہا ہے۔

پورا ایک پاور اسٹریکچر کھڑا ہوگا۔ یعنی دغا فریب، منافقت، مارکاٹ جنگ و جدال پھر مہرن کو لگا جیسے اقتدار عالم کی خون میں لت پت لاش بیچ سڑک پر پڑی ہے۔ اُس نے خوفزدہ آواز میں اپنے منگیترا کو مینا آشرم سے سبکدوش ہو جانے کا مشورہ دیا تو اقتدار عالم چمک کر بولا۔

”خاموش بیٹھی رہو۔ جلد ہی تم ایک اچھی خبر سنو گی“
”کیسی خبر؟“

”گھنی موچھوں والے سے ہماری کولڈ وار کے سلسلے میں۔“

دوسری طرف منڈی میں پلی اور کارپوریٹ فکرمیں ڈھلی اُس گڑیا کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہ تھا اس کو تو اقتدار نے کرائے پر حاصل کیا تھا، اس نے اپنے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں ایسی جگہ جہاں داخل ہوتے ہی سب کی نظر پڑے شیشے کے آبنوی فریم میں یہ عبارت لگا رکھی تھی۔

میں معاشی اور نظریاتی طور پر اس کی وفادار ہوں جو میری دانشوری کو کام میں لاتا ہے اور اس کی مجھے اجرت دیتا ہے۔

کچھ ہی دنوں میں اسماعیل کے پاس ناچتی گاتی یہ خبر پہنچ گئی کہ کسی ٹائٹ سروس بینک کے سنسان سے کاری ڈور میں ایک رات دو زخموں نے جن کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی گھنی موچھوں اور بھاری آواز والے بینک کے ایک گاہک کو گھیر لیا۔ وہ ریوالور والے کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر دائیں بائیں چلنے لگے اور اس کے کانوں میں اپنی باتیں اسے مخاطب کئے بغیر ڈالنے لگے۔ پہلا بولا۔

دیکھو میری جان سیاست میں ایک دشمن ہمیشہ پال کر رکھنا چاہئے، دوسرا زخما جواب میں۔

”اس لئے کہ دشمن آپ کو چوکنار رکھتا ہے۔“
”بالکل ٹھیک“ پہلے والا زخما فوراً بولا۔ ”لیکن سیاست میں آج جو آپ کا دشمن ہے کل دوست بھی

ہوسکتا ہے“ دوسرا زخما ہنسا اور جواب دیا۔

”کیونکہ طوطے کے خزانے سے اس نے جو غیر قانونی کمپنیوں کا جال بچھا رکھا ہے اور جو سرکاری لائسنسوں کے بغیر مالی اسکیمیں چل رہی ہیں ان کا کیا ہوگا“۔ دوسرے نے فوراً بات ماری۔

”پھر تو انفور سمنٹ ڈائریکٹریٹ دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے گا یا پھر بدنامی کے ڈر سے تم اپنے ہی ریوالور سے اپنے سر میں گولی مار لو گے“۔ ابھی تک دونوں زخے آپس میں ہی باتیں کر رہے تھے اور ریوالور والے کو دیکھ بھی نہیں رہے تھے لیکن اب زخے نمبر ایک نے اشارے سے گھنی موٹھوں اور ریوالور والے کو روکا، اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر نقش انداز کی بازو روٹنگ منگ کے ساتھ بولا۔

”اب جانی آخری بات۔ جلدی فیصلہ کرو کہ تم کو مینا جوگن سے لڑنا ہے یا صلح کرنا ہے؟“ گھنی موٹھوں والا غصے سے ابل رہا تھا اس نے زخے کی کلائی پکڑ لی۔ زخما چلا یا۔

”اوئی میں مری۔ مردو امیری عزت لوٹ رہا ہے“۔ لوگ ادھر مخاطب ہوں اس سے پہلے کلائی چھوڑ دی گئی تھی اور دونوں زخے منظر سے باہر ہو چکے تھے۔

یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ راہ چلتے سڑک پر دو زخے گھنی موٹھوں والے کو اتنا سب کچھ کہہ جائیں اور اس کے جو اسٹ ڈائریکٹریٹ یعنی دانسنے ہاتھ اسٹیل کو خبر نہ کی جائے جبکہ اُس رواں دواں دولت اور طاقت کا سرچشمہ اسٹیل خنک ہی تو تھے۔

یہ میٹنگ اسٹیل خنک کے خاص پرائیویٹ کمرے میں پوری رازداری کے ساتھ کسی کے علم میں لائے بغیر ہوئی۔ اسٹیل خنک اُس ایک واقعے کی تفصیل پر گہری نظر رکھ کر اپنے بھاری موٹھوں والے ساتھی کو یاد دلا رہا تھا۔

”یہ اُس حادثے کا جواب ہے جس میں دو زور پشت آدمی اقتدار عالم کو دایں بائیں گھیر کر اسے

خوفزدہ کر دینے والی باتیں سنا کر گئے تھے“۔ بھاری موٹھوں والے نے اقرار میں گردن ہلائی، ”وہ تو ہم نے ہی بھیجے تھے“ اسٹیل تیوریوں پر بل ڈال کر غصے سے بولا ”مجھے افسوس ہے کہ اس سانحے کے پیچھے میرے ہونے والے داماد کا ہاتھ ہے“۔ بھاری موٹھوں والا یہ سن کر دہنی مسکراہٹ مسکرایا اور بولا۔

”صرف ہونے والا داماد ہی نہیں، اگر تمہاری بیوی بھی اس میں شامل ہوتی تو بھی یہ تعجب کی بات نہ ہوتی۔ میں تمہارے پاس یہ شکایت لے کر ہرگز نہیں آیا ہوں۔ ہم جو کام کر رہے ہیں، یعنی دولت اور طاقت کا جو کھیل کھیل رہے ہیں اُس میں رشتوں کی حقیقت تاش کے پتوں کے محل سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتی، یہ بات میں بھی اچھی طرح سے جانتا ہوں اور تم بھی“ اسٹیل نے بھاری موٹھوں والے کی بات کی تائید کی تو بھاری موٹھوں والے نے آنکھیں بند کیں اور بڑی کمزور آواز میں بڑبڑایا۔

”سیدھی بات یہ ہے کہ یہ سانحہ اور سڑک پر گستاخانہ طور پر زخوں اور زانوں کے ہاتھوں ہمیں دہشت زدہ کرنے کا یہ عمل صاف بتا رہا ہے کہ Power Shift ہوئی ہے۔

کچھ دنوں سے مہرن کو لگ رہا تھا کہ گھر یلو تلخیوں سے پیدا ہونے والے اس کی ماں کے آنکھ کے کچھ آنسو خود مہرن کی آنکھوں میں بھی تیرنے لگے ہیں۔ وہ بار بار سوچتی آخروہ کیا چیز ہے جو اس کے منگیتر سے اسے خاموشی کے ساتھ خوفزدہ کرنے لگی ہے۔

مہرن کو لگا کہ اقتدار کے نزدیک خوبصورتی اور علم کے معنی وہ نہیں جو مہرن کی نظروں میں ہیں۔ وہ اس علم کو علم نہیں مانتی تھی جس سے بصیرت حاصل نہ ہو۔ یہ اس روز کی بات ہے جب وہ کافی ہاؤس میں اقتدار کے ساتھ بیٹھی تھی اور ساتھ میں کارپوریٹ فکر میں ڈھلی وہ جاپانی گڑیا بھی تھی۔ جو فوراً بول پڑی تھی۔ ”یہ بصیرت کیا چیز ہوتی ہے۔ ہماری دانشوری بت شکنی کے چکر میں

نہیں پڑتی۔ ہماری دانشوری تو ادھر جھکتی ہے جدھر طاقت اور اتھاریٹی ہوتی ہے۔ جب تک اقتدار صاحب کے پاس طاقت اور اختیار ہے ہم ان سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔ مہرن غصے میں اٹھ کر چلی آئی، اقتدار نے اسے روکا بھی نہیں۔

اس دن مہرن نے جب باپ کی دراز کھولی تو ریوالور کی کچھ گولیاں رکھی ہوئی دیکھیں تو غصے سے متمتاتے ہوئے گالوں کے ساتھ سوچتی رہی، کہ ان میں سے کس گولی پر اُس بازار و گڑیا کے پیچھے اقتدار عالم کا نام لکھا ہوا ہے۔

انہیں دنوں مہرن کو معلوم ہوا کہ طوطا آشرم کا طاقت ور بھاری موٹھوں والا اقتدار کو اپنی کمپنی کا اعزازی ممبر بنا کر دوستی کا ہاتھ بڑھانے جا رہا ہے، مہرن نے فون پر اقتدار سے اس کی تصدیق چاہی تو اس نے جواب دیا۔

”ہمارا کام پیسہ کمانا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی ضد بن کر نہیں رہ سکتے“۔

”پھر انھوں نے ہماری تو بین کیوں کی؟ مہرن چیخنی ”مجھے میرے گھر سے نکلوا دیا“

”تب انھیں ایسا لگا تھا کہ ہم ان سے کمتر ہیں۔ اب انھیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہمارے بھی طوطے ہیں، اچھا پھر بات کرونگا ابھی جلدی میں ہوں“ فون کاٹ دیا گیا اور مہرن اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔

اقتدار عالم اب بہت کم مہرن سے مل پاتا تھا۔ ایک معمولی مینا کے وسیلے سے عام لوگوں میں اس کی شہرت آدی واسیوں کے میجا کی بنتی جا رہی تھی اور وہ اپنی پارٹی میں روز بروز باعزت سے باعزت مقامات حاصل کر رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مینا کی مالکن شتابو کو اس جاپانی گڑیا کے ساتھ کبھی کبھی اونچے سیاسی کلیاروں میں گھومتا ہوا پایا جا رہا تھا۔ شتابو نے مینا کو پوری ایک جوگن کار روپ دے دیا تھا، اسے مقامی آدی واسیوں کی زبان سکھانے میں بڑی محنت سے اپنے وسائل

بھی اس کا نہر ہاتھا۔ وہ اپنی ماں کو اپنے شوہر کے انتظار میں رات رات بھر روتے دیکھ چکی تھی، اسے لگا کہ وہ جس بازار میں بک سکتی تھی وہ بازار اُڑ چکا ہے۔ اس نے طے کیا کہ وہ کسی کو اقتدار عالم کا شکار نہیں بننے دے گی۔ دوسرے دن وہ اقتدار عالم کی میننگ میں جہاں بھاری موٹھوں والے کو ممبر بنایا جانے والا تھا، خاص تیاری کے ساتھ گئی، اس نے دیکھا اقتدار کا چہرہ شراب کے اثر سے تہمتار ہاتھا۔ مہرن نے اپنے دونوں ہاتھ اقتدار کے کندھوں پر رکھے اور اس کے کان میں دھیرے سے بولی۔

”ہم کوئی کام ایسا نہیں کر رہے جو کتابوں میں لکھا جائے گا، یہ اخباروں میں رہ جانے والے کام ہیں۔ پھر اس نے اپنے لباس کے اندر چھپے ریوالور کے لوہے کو محسوس کر کے دیکھا اور اطمینان سے ریوالور نکال لیا لیکن جب اس کی نال اقتدار کی گردن کی طرف گھمائی تو کیا دیکھتی ہے کہ اقتدار کی برابر والی کرسی پر ایک دوسرا اقتدار بیٹھا ہے، پھر دیکھتی ہے کہ تیسری اور چوتھی کرسی پر بھی اقتدار ہے، وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی جب اس نے دیکھا کہ ہال کی ہر کرسی پر اقتدار عالم بیٹھا تھا۔ مہرن کو یقین نہیں آیا۔ دیوانوں کی طرح ایک ایک چہرے کے قریب آنکھیں لے جاتی، غور سے دیکھتی مگر وہ اسے اقتدار عالم ہی نظر آتا۔ اتنے ڈھیر سارے اقتدار عالموں کو ایک جگہ دیکھ کر وہ کانپ گئی۔ وہ کس پر گولی چلاتی۔ کچھ دیر تک وہ اس اقتدار عالم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی جس کو وہ گولی مارنا چاہتی تھی مگر اس ناکامی پر آخر کو پورے بدن سے کانپنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتی باپ کی شفقت نے اسے بڑھ کر سنبھال لیا۔ اور تو کچھ کیا ہوتا البتہ دوسرے دن ہاتھ میں ریوالور لئے اسماعیل کی ہانہوں میں ایک بیہوش لڑکی کی تصویر اخباروں کے پہلے صفحے پر ضرور چھپی تھی۔

□□□

◆ نیادور جون ۲۰۱۸ء ۲۵

چنگ کروہاں سے چلی آئی۔ باہر آئی تو اس نے دیکھا مینا کی کچھ تصویروں کے قدام Blow ups دفتر کی باہری دیوار پر لگائے جا رہے تھے۔ مینا واقعی بڑی پُرکشش جوگن نظر آرہی تھی۔ ایک تصویر کے نیچے لکھا

تحلیل ہوئے بن کے دھواں، شہر میں ایسے ہم پھر نہ گئے گاؤں، کبھی گھر نہیں دیکھا



معروف ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی
فضیل جعفری بھی نہیں رہے۔

ان کا شمار اردو کے نمائندہ دانشوروں میں ہوتا تھا۔ ان کی غیر ادبی تحریریں بھی ادبی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ادارہ نیادور جلد ہی فضیل جعفری کی ادبی خدمات پر ایک شمارہ معنون کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس میں اسرار گاندھی، علی احمد فاطمی وغیرہ کے مضامین شامل رہیں گے تھا ”محبت کرنے والی چڑیا“۔

مہرن نے اس کے نیچے غصے میں لکھا ”اور تم؟“ پھر ایک بڑا سا سوا الین نشان لگا کر چلی گئی۔ ساری رات وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی، اس کا باپ تو پہلے ہی اُس سے چھن چکا تھا، اب اس کا منگیترا

استعمال کئے تھے۔ جاپانی گڑیا نے مینا جوگن کی بھیلوں کی بستی میں اخبار والوں کو ساتھ لے جا کر کچھ شو کئے تھے اور اقتدار عالم کے ساتھ سرکاری گیٹ ہاؤس میں ٹھہری تھی۔ مہرن کے شب و روز میں اس کے منگیترا کا رول تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ مینا جوگن کی انتظامیہ کمیٹی میں اس کے باپ کے حلیف گھنی موٹھوں والے کو اس کے منگیترا کے ذریعے شامل کئے جانے کی خبر خاصی گرم تھی۔ مہرن نے بہت کوشش کی کہ فون پر اقتدار عالم سے رابطہ قائم ہو جائے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

وہ غصے کی حالت میں اقتدار کے دفتر پہنچ گئی جہاں دوسرے دن مینا جوگن دھام کی انتظامیہ کمیٹی کی میننگ ہونے والی تھی، اس نے دیکھا ڈانس کے سامنے مینا جوگن دھام کے سینئر ممبر بیٹھے ہیں اور جاپانی گڑیا کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے جسے دکھا کر وہ کہہ رہی ہے ”یہ ہوشیار سنگھ بھگت کی انگریزی ناول ہے، تین مہینے میں اس سڑی ناول کی ۵ لاکھ کاپیوں کو پبلشٹی اور مارکنگ کے دم پر بکوا دینا ہمارے بائیس ہاتھ کا کام ہے۔ پھر اس جاپانی گڑیا نے ایک سیانی لڑکی کو اپنے پاس بلا کر کھڑا کیا وہ شتابو کی لڑکی تھی، میز پر سے لکڑی کا پوائنٹر (Pointer) اٹھایا اور اس کی نوک لڑکی کے ایک پستان پر رکھ کر بولی۔

”یہ جیسے آپ کو نظر آرہے ہیں ویسے ہیں نہیں۔ بلکہ جیسے بازار چاہتا ہے ویسے ہیں۔ اس طرح اس لڑکی کی آنکھوں کی پتلیوں کے رنگ موسم اور مفلوں کے مزاج کے مطابق لینس کے ذریعے بدلتے رہتے ہیں۔ (ہونٹوں پر پوائنٹر رکھ کر) نو طریقوں سے ہم نے اسے مسکراتا سکھایا ہے۔ مارکنگ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ جب چاروں طرف سے آپ گھیرے میں لے لئے جائیں اور پھر وہ اتنا تنگ ہو جائے کہ آپ کو لگے کہ آپ کی بوٹیاں سُج رہی ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ آپ کہاں کھڑے ہیں“ شتابو کی لڑکی کی معصومیت یوں چھتے دیکھ کر مہرن سے برداشت نہ ہوا۔ وہ غصے سے پیر



انیس رفیع

AH141، سیکٹر ۲، سالٹ لیک، کولکاتا

موبائل: 9432646374

ایک اور برزخی

وجہ تھی یہ مخدوش اور بے مکین دو منزلہ عمارت۔ مخالف طرف کی عمارت کی کوئی کھڑکی یا کوئی دروازہ گلی کی طرف نہ کھلتا تھا۔ اس کی دیواروں پر راہگیر اور کنگالی پیشاب کیا کرتے تھے۔ بے روک ٹوک، کوئی ٹھکاری بھی نہیں مارتا۔ ایک ازار بند کھولتا، کوئی دھوتی اٹھاتا اور شروع ہو جاتا۔ سنڈاس بنی دیوار پر البتہ ایک تختی ضرور لگی تھی Commit No Nuisance (پیشاب کرنا منع ہے۔)

دھیرے دھیرے یہ عمارت آسیب زدہ عمارت مشہور ہو گئی اور ایک حکایت بھی جڑ گئی۔ کبھی کسی جہاز راں کمپنی نے اپنے عملوں کے لئے اسے کرائے پر لے لیا تھا تا کہ وہ عارضی طور پر یہاں قیام کریں اور غیر ملکی جہازوں کی واپسی کے بعد یہ ہاسٹل خالی ہو جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران کسی اطالوی کمپنی کا ایک بڑا جہاز جس کے سیکڑوں عملہ تھے، سمندر سے لگی ندی کے Dock میں لنگر انداز ہوا تھا۔ چونکہ سمندر میں جہازوں کا سفر طویل اور آرتادینے والا ہوتا ہے اس لئے اس کے افسر عملے اکثر اپنے بیوی بچوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ اس جہاز کے عملے کے لئے یہ پورا ہاسٹل مہمان خانے کی طرح سجایا گیا۔ سیر و تفریح کے پروگرام مرتب کئے گئے۔ جہاز کا کیپٹن بیحد سخت گیر اور ڈسپلن کا بڑا پابند تھا مگر خالی وقت میں ایک خوش مزاج اور جمال پرست فرد تھا۔ اس کا ایسا ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ یہ اس کا پہلا سفر تھا۔

اس کا ایسا ہونا حیرت کی بات تھی۔ اطالوی

کمروں والا مکان تھا۔ کمرے کی دیواریں مخدوش ہو گئی ہوں گی۔ ضرور ہوئی ہوگی۔ مدتوں سے چونا کاری کے بغیر دیواریں کتنا سنہاں کریں گی۔ بے مرمت گھر کو تو بلے میں تبدیل ہونا ہی ہے۔ سال دس سال، سو سال۔ تاب ہونی چاہئے سنبھالنے کے لئے۔ تاب تو ہوتی ہے۔ کورناک، جامع مسجد، لال قلعہ، تاج محل۔ پران کے پیچھے سرکار ہے۔ سب کی وارث۔ انڈسٹری ہے، ٹورسٹ انڈسٹری۔ منزل شوق۔

اس لاوارث مخدوش کا شوق کسے ہونے لگا جو لے گا زیاں بار ذمہ داریوں سے لدا جائے گا۔ ایک خبر یہ ملی تھی کہ ممبئی کا کوئی پارسی تاجر اس میں دلچسپی لے رہا ہے مگر اس کی ملکیت کون دے گا۔ کوئی وارث! مگر وہ ہے کہاں؟ شہر کے نقشے پر پلاٹ نمبر تو ہے مکان اور مالک مکان کا کوئی سراغ اور کوئی اندراج نہیں۔ چوہدہ یوں پر مالکان کے نام ہیں مگر دس پشتوں قبل کے۔ پیشتر دستاویزات دیکھ کے کھائے ہوئے۔ مول کوڑیوں کے ہوں گے۔ بازار نہ تھا۔ دور گلی کے دوسرے نکل پر ہاتھ رکشہ بنانے والوں کی چھوٹی سی فیکٹری اور مکان تھا۔ شہر کے مرکز کو جانے والے آنا جانا ادھر ہی سے کرتے۔ شام ہوتے ہی بڑی سڑک سے ملی اس نکل پر گیس کی سہ شاخہ جتی روشن ہو جاتی اور گلی نیم تاریک بلکہ اندھیری۔

قصہ دن کا ہی ہے۔ وقت، وقوع، اطرافات اور کردار سب دکھیں گے۔ پر دھندلے دھندلے روشنی کم ہوتو اتنے ہی نظر آئیں گے۔ اس پھیکے پن کی

گلی نیم تاریک تھی۔ وہ اس لئے کہ برسوں پہلے راجہ بازار میں واقع گیس سپلائی کمپنی بند ہو گئی تھی۔ پورے شہر میں گیس کی پائپ لائن بچھی ہوئی تھی جن کے ذریعہ شہر کی عمارتوں، ہسپتالوں، ہوٹلوں اور گھریلو کارخانوں میں گیس سپلائی ہوتی۔ گھروں میں یہ رسوئی گیس کی طرح استعمال ہوتی اور شہر کی سڑکوں پر اسٹریٹ لیمپ کو روشن رکھنے کے لئے۔ گیس سپلائی ضروری خدمات کے زمرے میں رکھی گئی تھی کہ اس کے فیل ہونے سے رسوئی میں کھانا بننا بند اور سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹ گل ہو جاتی۔ گلی کو چوں کے نکل پر لگی یہ سہ شاخہ گیس لائٹیں تو پہلے بند ہوتی۔ گلیاں اندھیروں میں ڈوب جاتیں۔ دراصل اس گلی کا مقدر ہی اندھیرا تھا۔ باہر دن کتنا بھی روشن ہو پر گلی نیم تاریک ہی رہتی تھی۔ بلڈنگوں کے مکین اپنے فلیٹوں میں متبادل انتظام کر لیتے۔

دن کے دس بجنے کے بعد گلی میں سناٹے کا عمل دخل بڑھ جاتا۔ آمد و رفت بس اتنی تھی کہ ویرانی کا احساس نہ ہو۔

اس نیم تاریک گلی کے نکل پر ایک قدیم طرز کی حویلی نما عمارت تھی۔ نہ جانے کب سے بالکل ویران خالی پڑی تھی۔ مالکوں نے کوئی چوکیدار یا دربار بھی مقرر نہ کر رکھا تھا۔ کارپوریشن والوں نے کہیں پر بھی دیوار پر Enemy Property کی تختی بھی نہیں لگائی تھی۔ ایسی لاوارث کوٹھی تو شاید کسی نے نہ دیکھی ہو۔ سنا گیا تھا کہ پہلی اور دوسری منزل ملا کر چوبیس

زبان کا یہ شاعر پیٹ رارج کا پرستار تھا جو مکیا و پلی کا آمری تصورات کا سخت مخالف تھا۔ فکری آزادی کا نویدی اور غیر ضروری رسمی و تہذیبی دباؤ کا منکر۔ اس کا اطالوی شاعری درجہ کمال کو پہنچنے کے مرحلے میں تھی۔ وہ سانیٹ نویسی کا دلدادہ تھا، اس کی ایک نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

میرا میں مجھ سے ہی فرار ہونا چاہتا ہے جیسے وہ کوئی دوسرا ہی ہو گیا ہو
کبھی کبھی ننگے پاؤں، ننگے سر اور ننگے بدن میرے چیمبر میں گھس آتا اور پھر

توڑ پھوڑ مچاتا پھر میرے روبرو فرش پر پالتی مار کر بیٹھ جاتا

کبھی اسے میں نے کریم انفس اور فیاض دیکھا تھا
شرمیلا اور نرم خو

مگر اب...
وہ ایک جنگلی وحشی بن چکا تھا

صرف ایک روٹی میرے ہاتھوں سے چھیننے کیلئے وہ بھول گیا تھا کتنے خطرے ہیں اس کے آگے
مگر وہ توڑ کا ہی نہیں

بدلتا جا رہا تھا
بدلتا جا رہا تھا شب و روز کی طرح

اس کا ایسا ہونا حیرت کی بات تھی۔ مسز دائم رے تجربہ کار عورت تھی۔ مگر مس ذکر یا کا یہ پہلا سفر

تھا۔ ہاسٹل میں بھی عملوں کی تفریح، قیام و طعام کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ ڈنر کے قبل ہاسٹل کے عارضی رقص گھر

میں عملے، موسیقی کی دھنوں پر مجور رقص و سرود تھے کہ روشنی گل ہو گئی۔ کہرام مچ گیا۔ پولیس کی آمد سے پہلے یہ

ہنستا کھیلتا طائفہ تہ تیغ کر دیا گیا۔ بربریت کے اس تماشے سے سارا اطراف سرا سیمہ ہو گیا۔ حلق سوکھ گئے۔

آوازیں گھٹنے لگیں۔ برسوں یہ علاقہ خوف و ہراس کے گھیرے میں رہا اور یہ عمارت خونخونی عمارت کے طور پر مشہور ہو گئی۔ اس میں بھوتوں نے بسیرا کر لیا تھا۔ اب

بھی لوگ اس عمارت کو دیکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔

یہ عمارت نہیں بندرگا ہوں کے جیالوں کی قبر ہے۔ گلی محلے کے لوگ کبھی کبھی اس سنے ہوئے سانحہ کا

ذکر کر بیٹھتے، کیسا طر حدار جوان تھا ولکوکس، کیپٹن کی وردی میں خوب جمتا تھا۔ ذکر یا مارلن منرو اور مسز

دیمورے ایلز ایبٹ ٹیلر۔ سب تہ تیغ ہوئے۔ بچے والے بھی نہیں بچے۔ بس خدا او پر تنہا بیٹھا سب کچھ دیکھ

رہا تھا۔ زمین لہورنگ تھی۔ آواز پاٹ دار تھی۔ کمانڈ بھی دیتا تو گلے کی رگیں تن جاتیں۔

وہ رہنے والا فلورنس کا تھا جیسا کہ معلوم ہوا۔ بچپن وہیں گزرا تھا۔ پلے اسکول، کنٹر گائن

Standard وغیرہ اس نے وہیں سے کیا تھا۔ اونچی پڑھائی کے لئے اسے روم بھیجا گیا کہ چہ اسکول اور کالج

کے نچلے درجات میں بہت ہونہار اور ذہین نہیں تھا مگر فیزیکل کا ڈٹ ٹریننگ میں کوئی اس کے آس پاس بھی

نہیں تھا۔ پرنسپل اور اساتذہ اس سے زیادہ خوش نہ تھے۔ کالج میں طلباء کے لئے آنے والے اچھے موقع

اس کے نام کبھی نہ کئے جاتے۔ وہ اپنی شرارتی اور مہماتی اعمال کے لئے خاصی شہرت رکھتا تھا۔ مگر اس

نے کالج یا اسکول آتھارٹی کو کبھی ایسا موقع ہاتھ نہ آنے دیا کہ اسے وہاں سے نکال دیا جائے۔

کالج کے دنوں میں ولکوکس کے معاملات اور معمولات جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ بیان کنندہ کی

آواز پھر تھرانے لگی تھی۔ چند ساعتوں کے لئے وہ گہری خاموشی میں ڈوب گیا جیسے زخروے میں یکا یک کوئی

شے اٹک گئی ہو۔ اس نے کوشش کی، خاموشی ٹوٹی اور گفتگو جاری ہوئی۔

جیسا کہ میں نے کہا کالج کے پرنسپل اور وہاں کے ارباب اختیار اسے کوئی سنہرا موقع نہیں دینا چاہتے

تھے مگر جب نیوی ریکروٹمنٹ بورڈ نے اسے نیول افسر کے عہدے کے لئے منتخب کیا تو ارباب اختیار نے جانا

کہ ہر ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات نہیں ہوتے۔

پھر بھی وہ داؤ کھیلنے کے آرزو مند تھے مگر پرنسپل نے ان سے معذرت چاہی اور ولکوکس کو اچھے چال چلن کی سند

دے دی۔ کتنی کم عمری میں اتنے بڑے جہاز کا کیپٹن بن گیا۔ سب حیرت زدہ تھے۔ ذکر یا کم عمر تھی مگر ولکوکس

کی چاہت میں ڈوبی جا رہی تھی۔ کچھ چاہت کچھ ضرورت دونوں مل کر اسے ڈیک پر لے آئی تھی۔ مسز

دایمورے نہ صرف اس سے شفقت کرتی بلکہ نگرانی بھی رکھتی۔ دونوں ایک ہی کیمین میں دراز ہوتیں۔ کیپٹن کو

جب کبھی سیل بلا کا احساس ہوتا فوراً کیمین کو الٹ کرتا پھر دیگر کریومبرز کو۔ مگر اس عمارت میں وہ سیل بلا آئی کہ

آنکھیں خون سے تر ہو گئیں۔ کس نے پھیلی یہ ہولی اور کیوں؟ کہیں کوئی... پر کیا؟ ایک بھید اور بس۔

کتنے دن بیت گئے۔ عمارت کھنڈر میں تبدیل ہونے کو ہے۔ سچ شہر کی کوٹھی۔ لاوارث، قیمتی اثاثہ کوڑی

کے مول بھی نہ بکے! کارپوریشن کو فکر لاحق ہوئی۔ ٹکڑی صفائی کرائی گئی۔ دیوار پر Commit No

Nuisance کی تہی بھی لگوا دی۔ نیم تاریک گلی کا سناٹا کچھ اور بڑھ گیا۔ لوگ حسب معمول اسی تہی کے نیچے یا

اسی پر پیشاب کرتے۔ بدبو کا بھسکا اٹھتا، لوگ ناک دبا کر نکل جاتے۔ کارپوریشن والے اس بدعت سے

پریشان تھے۔ انہیں خیال آیا کیوں نہ اس کھنڈر کو نیلا کر دیا جائے۔ شاید کوئی نیامکین ایسا آئے جو بھوت پریت کو

رگید کر باہر کر دے۔ سناٹے اور نیم تاریکی کو دور کر دے۔ ایسا ہی ہوا! نیامکین آیا۔ ہال۔ بچے بھی آگئے۔ کوئی

جوان کوئی نیم جوان، دونوں بھائیوں کی چار لڑکیاں تھیں۔ چاروں کی چاروں بہادر اور اسمارٹ۔ لڑکے ذرا چھوٹے

تھے۔ جب کوئی فارغ ہونے کے لئے بیٹھتا یا کھڑا ہوتا پانی کی بھری بالٹی پہلی منزل کے دراندے سے پھینکتی

اور غائب ہو جاتیں۔ بیچارہ گنہگار شخص۔ پانی میں شرابور لت پت بھاگتا۔ چاروں دراندے سے اندر ہال میں

بھاگ کر خوب قہقہہ لگاتیں۔ اس تدارکی کارروائی سے کچھ کمی تو آئی مگر وہ لوگ جو پہلی بار اس کو بچے میں آتے وہ

شراپور ہوتے اور دیوار سے لگی تختی کو پڑھ کر تیز قدموں سے نکل کر وہاں پہنچ جاتے۔

ایک صبح لڑکیوں نے نیچے بچوں کے شور و غل سنے۔ 'نگا مانگے پانی، یاد کرو اب نانی، ننگا گھبرا یا ہوا تھا پراسے زور کی لگی تھی۔ تختی کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھا، بچے دور جا چکے تھے۔ اطمینان سے بیٹھ کر دیوار پر چھڑکاؤ کرنے لگا۔ اس کی دھاریں سر کے اوپر چپکی تختی تک پہنچتی۔ دھل کر تختی کچھ اور چمکتی اور وہ کھڑا ہو کر کہتا، فتح، فتح، قہقہہ لگاتا اور دوڑتا ہوا تار یک لگی کے دوسرے چھوڑ کر طرف بھاگتے بھاگتے تحلیل ہو جاتا۔ اس لگی میں روز یہ عجیب و غریب واقعہ رونما ہوتا تھا۔ وہ ننگ دھڑنگ روز آتا اور اپنا پسندیدہ عمل دہراتے۔ وہ ورائڈے میں روٹے بھی پھینکنے لگا تھا۔ جن سے لڑکیوں کے مجروح ہونے کا خطرہ تھا۔ ان لوگوں نے اس ورائڈے پر آنا جانا چھوڑ دیا۔ سرانڈھ پھیلتی جا رہی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا، اس نے پردہ کر لیا۔ مگر محلے والے دھیرے دھیرے اس بڑے Nuisance سے گھبرانے لگے تھے۔ اس تختی کے

عافیت سمجھی مگر وہ متفقہ طور پر یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اسے کپڑے ضرور پہنائے جائیں گے۔ درزی سے گزارش کی گئی کہ اس کے ایکسٹرا لارج قمیص اور پتلون سی دے۔ درزی نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کر دیا۔ اب مسئلہ تھا اس دیوانے کو جملہ تہذیب پہنانے کا۔ ننگ دھڑنگ شخص بلکے بلکے قدم سے تختی کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے ہی فارغ ہونے کے لئے تیار ہوا۔ لوگوں نے اسے دھردبوچا۔ بہت کوشش کی کہ ان کے شکنجے سے نکل بھاگے مگر لوگوں نے اس کی کمر تک پتلون پہنا ہی دی۔ پتلون پہننے ہی جیسے شرم سے گڑ گیا ہو۔ دونوں ہاتھوں سے بدن چھپا کر زور کی چھلانگ لگائی اور لوگوں کے زرخے سے نکل بھاگا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ آج مجھے ظالموں نے ننگا کر دیا۔ نہ میں زمین کا رہا، نہ آسمان کا۔ تو لوگو! یہ جان لو کہ میں تری شکوہوں۔ عالم برزخ کا دیوتا۔ عالم برزخ... عالم برزخ... عالم برزخ... اس واقعہ کے بعد گلی مزید سنسان اور تاریک ہو چکی تھی اور نئے مکین کہیں اور منتقل ہو گئے تھے۔

□□□

نیچے تو سبھی فارغ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم میں سے بھی کوئی۔ اس عمارت میں آنے والی نئی فیملی کی بچیاں۔ اس ننگ دھڑنگ لمبے ڈر سے ورائڈے کو ترک ہی کر دیا۔ ان کے ساتھ تو بڑا سا نسخہ ہوا۔ اس گھر کے بزرگ تو ارشد پن ہیں۔ مرشد کی خدمت میں غرق۔ بیٹے سب دکان یا دفتر کی طرف بھاگتے ہوئے۔ گھر خرید کر لاکرے ہو گئے تھے۔

کچھ لوگوں کا قیاس تھا کہ یہ شخص ننگے ناگا سادھوؤں کے گروہ کا تھا۔ کبھی جھٹک کر شہر کی اور چلا آیا اور دیوانہ ہو گیا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ہم سب اسے پکڑ کر سب سے پہلے کپڑے پہنا دیں۔ اس کی ستر پوشی بہت ضروری ہے لہذا اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے ایک درزی کو بلا یا گیا جو محلے کا ہی تھا اور اس قصے سے پریشان بھی۔ کہا گیا کہ وہ اندازاً اس کی ناپ کے کپڑے سل دے۔ جب وہ فارغ ہو کر پلٹا تو اس کے ہاتھ میں استبجے کا ڈھیلا تھا۔ نشانہ سادھ کر درزی کی پیشانی پر مارا۔ آنکھ بچ گئی مگر پیشانی لہولہاں تھی۔ ننگے کی جارحیت کو دیکھ کر وہاں سے لوگوں نے ہٹ جانے میں

اردو زبان کا سیکولر کردار (حصہ دوم)

اردو ادب میں اتر پردیش کے غیر مسلم ناول نگاروں کی خدمات پر نعمان قیصر اور فارسی ادب میں ہندو شعراء کی خدمات پر ڈاکٹر سعدیہ جعفری، مکلیشور کی ادبی خدمات پر مشرف عالم ذوقی اور بلونت سنگھ کے فن پر رضوان انصاری،

تصوف اور ہندوستانی روحانیت پر ڈاکٹر نریش کے مضامین

گلزار دہلوی، رتن سنگھ، چندر بھان خیال، جینت پرمار، دیپک بدکی، راجیو پرکاش ساحر، وشال کھلر، خوشبیر سنگھ شاد، پونم کوثر، رینو بہل، منیش شکلا، نلنی و بھانازی، سیاسچد یو، رام پرکاش بیخود، پی پی شریواستورند، اویناش امن، رمیش پانڈے سکھر، دیپک نشاط، دیپک دانش وغیرہ کی تخلیقات، ہندوستانی زبانیں، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر مشمولات

اگست ۲۰۱۸ء کا 'نیا دور' اردو زبان کے انہیں اوصاف پر مبنی ہوگا



خورشید حیات

کوآرڈینر 16/3، نیو این ای کا لونی، بلاسپور
موبائل: 9752475934

سورج ابھی جاگ رہا ہے

اکتوبر کی ایک شام تھی۔ میں دفتر سے چھوٹے ہی گھر جانے کے لئے باہر نکلا ہی تھا کہ تیز آندھی چلنے لگی۔

آندھی کیوں آتی ہے نغمہ؟

آندھی کا اس زمین سے کیا رشتہ ہے؟

تم بھی کیسے آدمی ہو؟ زندگی کی اتنی منزلیں

طے کر چکے، اور اس طرح کا سوال پوچھتے ہو۔ اس

طرح کا سوال تمہاری زبان سے اچھا نہیں لگتا۔ یہ

سوال بشری اور عائشہ نے پوچھا ہوتا تو سننے میں بھی اچھا

لگتا اور جواب دینے میں بھی۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد

ہے، جب میں یونیورسٹی سے واپس لوٹی تھی اور گھر میں

داخل ہوتے ہی بشری سوال پوچھ بیٹھی تھی۔

”اماں! سورج گرہن کیسے لگتا ہے؟“

”بیٹی تھوڑا آرام تو کر لینے دو، ابھی تو

میں.....“

”آرام، آرام تو حرام ہے ماں، بشری بول

پڑی تھی۔

”اچھا بابا سنو! جب سورج اور زمین کے بیچ

میں چاند آجاتا ہے تو سورج گرہن لگتا ہے۔“

”اماں جب سورج اور چاند کے بیچ میں زمین آ

جائے تو؟“

تب چاند گرہن لگے گا، کیونکہ زمین، سورج کا

چکر لگاتے لگاتے، سورج اور چاند کے بیچ آجاتی ہے۔

بشری کے سوالوں کا جواب دیتے وقت مجھے

وہ زمانہ یاد آ گیا تھا، آفتاب! جب ہم دونوں کالج

کے دوستوں کے ساتھ Excursion میں آگرہ

گئے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھی تاج محل کے

سامنے الگ الگ پوز میں تصویر کھنچوانے میں لگے

تھے اور ہم دونوں کبھی تاج محل کو دیکھتے تو کبھی جمنا کی

لہروں کو اور پھر لہروں کے بیچ مجھے ایک آواز سنائی

پڑی تھی۔

”نغمہ تم چاند جیسی ہو“

اور آفتاب تم؟ میری زبان سے اچانک یہ

جملہ نکل پڑے تھے۔ یہ جانے بغیر کہ ابھی جو آواز

میرے کانوں میں سنائی پڑی تھی، وہ آفتاب کی تھی یا

پھر جمنا کی لہروں کی۔ مگر آفتاب کی آوازیں بھی تو جمنا

جیسی ہیں۔

لہر/لہر بہتا پانی/پاک پانی/ناپاک لوگ

لہر/لہر بہتا پانی/اونچی عمارت/بونے لوگ

میرے اندر شاید تم بول رہے تھے، یا پھر

میرے اندر بیٹھے ”میں“ نے لفظوں کو نئی زبان دے

ڈالی تھی۔ سارے کے سارے لفظ بول رہے تھے۔

میرے وجود کے اندر دل کی گہرائیوں میں کہ میرے

ہونٹ نہیں ہلے تھے۔ مگر تم نے میرے اندر کی آوازیں

لی تھی۔ تبھی تم نے کہا تھا۔

”وہ کوئی عمارت ہے یا بیٹھا ہے کوئی فرشتہ۔ سنا

رہا ہے وہ کہانی کریم خاں کی۔“

”نغمہ، کریم خاں تو تاریخ کے صفحات سے گم ہو

گیا ہے، آؤ جمنا کے تٹ پر، ان کے کٹے ہوئے ہاتھوں

کو تلاش کریں۔“

”کٹے ہوئے ہاتھ.....“

میں تمہاری فلاسفی کچھ کچھ سمجھ پائی تھی اور کچھ

کچھ نہیں اور جو نہیں سمجھ پائی تھی وہ مدتوں بعد حقیقت بن

کر سامنے آئی۔ پتا نہیں وہ لمحہ بھی تمہیں یاد ہے کہ نہیں

کھانے پینے کی ملاوٹ نے تمہاری یادداشت کو کمزور

بنادیا ہے۔ جس طرح بدرنگ ہو گیا ہے تاج محل فضائی

آلودگی سے۔

”اماں! اماں!! تم کہاں کھو گئیں؟“

”زمین سورج کا چکر کیوں لگاتی ہے، اماں!؟“

”بشری! اماں کو کھویا دیکھ کر سوال پوچھ بیٹھی۔ اچانک

بشری کے اس سوال نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ

دیا۔ ماضی کا سفر طے کرتے ہوئے میں نے حال میں

قدم رکھا اور پھر جواب دینے لگی۔

دیکھ بیٹی! اگر زمین سورج کا چکر نہیں لگائے

گی تو دن اور رات نہیں ہوں گے۔ یہ اس کی فطرت

میں شامل ہے۔ اس کائنات کی ہر تخلیق کسی کے

اشارے پر چل رہی ہے۔ یہ تم ابھی نہیں سمجھو گی۔ تھوڑا

بڑا ہونے کا انتظار کرو۔ ویسے تم اور تمہاری نسل اس عمر

میں ہم سے زیادہ باشعور ہے۔ ہم سے آگے ہے کہ ہم

تمہاری عمر میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ بڑے معصوم

تھے ہم!

بشری سوال پر سوال پوچھے جا رہی تھی اور میں

اس کے سوالوں کا جواب دیتی جا رہی تھی۔ تبھی عائشہ جو

پڑوس میں شیلا میڈم سے پڑھنے گئی تھی واپس لوٹ

آئی تھی۔ بشری کو میرے پاس بیٹھا دیکھ کر وہ بول

پڑی۔

کیوں بشری؟ اماں کے پاس کیا کر رہی ہے؟ اس سے پہلے کہ بشری بوٹی میں بول پڑی تھی۔ پہلے اپنی کتابوں کا تھیلا تو رکھ آؤ بیٹی!

کتابوں کا بوجھ جیسے مہنگائی کا بوجھ، اف! میں دھیرے سے بڑھائی تھی۔ عائشہ بھی تو اب بڑی ہو رہی تھی۔ کتابوں کے تھیلے کو پیٹھ سے الگ کرتے وقت ایسا لگا جیسے اس نے خود کو خود سے الگ کر دیا ہو۔ اس نے سوچا اس کا وزن تو صرف پندرہ کیلو ہے۔ مگر ان کتابوں کا وزن۔ کلاس میں دیے گئے، ٹیچر کے لکچر کا وزن، ہوم ورک کا پون کا وزن۔

عائشہ اپنے تھیلے کو ٹیبل پر رکھ کر بشری کے پاس آگئی۔

”آپا! تم اماں کو کیوں تنگ کر رہی ہو۔ اسکول سے آنے کے بعد تمہارے پاس اور کوئی کام نہیں ہے کیا؟“

”بس ایک سوال رہ گیا ہے۔ اسے پوچھ لینے دو۔“ بشری بول پڑی۔

اچھا تو پوچھو جلدی سے عائشہ بولی۔

”آندھی کیوں آتی ہے اماں!“

”بش بیٹی!“

میں نے ابھی جواب دینا ہی چاہا تھا کہ بش بول

پڑی۔

”اماں تم ناموں کو توڑ مروڑ کر انہیں گھریلو روپ میں ڈھالنے کی کوشش کیوں کرتی ہو؟ بشری جیسے اچھے نام کا تو تم نے قتل کر دیا۔ میری سہیلیوں کی مائیں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔ اندرا کو اندو۔ فاطمہ کو فاطو اور لڑکے دوستوں کی مائیں رحیم کو رحیمو، اسلام کو اسلمو..... ایسا کیوں کرتی ہیں مائیں؟؟“

بیٹی ناموں سے کیا لینا دینا۔ نام تو صرف پچپان کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ چھوڑو ان باتوں کو، اپنے سوال کا جواب سنو۔

زمین جب گرم ہو جاتی ہے تو ہوا بھی گرم ہو جاتی ہے اور ہوا گرم ہو جانے کے بعد ہلکی ہو کر اوپر اٹھنے لگتی ہے، جس سے خالی جگہ ہو جاتی ہے۔ اس خالی جگہ کو بھرنے کے لئے آندھی آتی ہے۔

”اور کچھ.....؟؟“

اب کچھ نہیں پوچھنا ہے۔ تھوڑا کھیلنے کے بعد ہوم ورک بھی کرنا ہے۔ ہم بچے تو کتابوں کے بوجھ تلے اپنی مصمصیت کھوتے جا رہے ہیں۔

وہ تو اکتوبر ۱۹۸۸ء کی شام تھی اور آج اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شام ہے۔ بشری نے جب یہ سوالات پوچھے تھے تو اس کا وزن صرف بیس کیلو تھا۔ اور اس کی کتابوں کا، لفظوں کا، سوالوں کے انت سلسلوں کا۔ یہ بھی ایک سبجک ہے آفتاب کہ تمہاری زبان سے بھی آج وہی سوال نکلا جو بشری نے پوچھا تھا۔

دس سال پیچھے کا سفر طے کر کے میرے اندر واپس لوٹ آئی تھی، نغمہ!

”آفتاب، کیا تم بشری جیسے ہو گئے؟“

نہیں، نہیں! میں تو آفتاب ہوں اور میری عمر تو..... چھوڑو عمر سے کیا لینا دینا کہ اپنی عمر تو ہر شخص چھپاتا ہے کہ شاید اسے خود کو بوڑھا ہوتا ہوا دیکھنا پسند نہیں، کہ شاید ڈر لگتا ہے موت کے قریب جاتے دیکھ کر۔

میرے اندر یہ کون بول رہا ہے۔ میں تو آفس کے باہر اسکول اسٹینڈ میں کھڑا ہوں اور آندھی تیز تیز چل رہی ہے۔ میں آندھی کا مقابلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ میں شعور کی رو میں بہ رہا ہوں۔ حال کا مقابلہ کرنے میں تو خود کو معدوم محسوس کر رہا ہوں مگر ماضی اور مستقبل میرے اندر ضرور بچکولے لے رہے ہیں۔ میرے اندر کبھی بشری اور کبھی عائشہ الگ الگ شکل میں ابھر رہی ہیں اور ڈوب رہی ہیں۔

میں حیرت زدہ کھڑا ہوں۔ نئے سرے سے

آندھی اور تاریکی کی کش مکش کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے۔ ہوا کی سنسنہٹ بڑی بھیا تک لگ رہی ہے۔

اسکوٹر اسٹینڈ لوگوں سے بھرا پڑا ہے کہ سارے لوگ گھر جائیں تو کیسے، آندھی کا مقابلہ کون کرے کنٹرول آفس کے باہر یوکلپس کا پیڑ بھی آندھی کا مقابلہ کرتے کرتے گر پڑا تھا۔ اس کی شاخیں الگ الگ خانوں میں بٹ چکی تھیں، زمین سے آگلی تھیں۔ ان کے بازوؤں کو آدمی کے بازوؤں کی طرح نہیں جوڑا جاسکتا تھا کہ آدمی کے کٹے ہوئے بازو تو جوڑے بھی جاسکتے ہیں مگر اس پیڑ کے؟

”گھور جھاڑ طوفان کے بے بند ہیا“ بار پینڈا جی بول پڑے۔

”اے طوفان سمسٹو لو پاٹ کورے دیو، شوکانو گھوش زور زور سے بڑھا رہے تھے۔ آفس کے بڑے بابو اس آندھی اور طوفان کے آگے خود کو بونا محسوس کر رہے تھے۔ اپنے ہونٹ سے بیڑی دبائے دھواں چھوڑتے ادھر ادھر اسکول اسٹینڈ میں ٹہل رہے تھے۔

سچائی بیڑی کا دھواں ہے جو فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔

دھواں دھواں سچائی

دھواں دھواں زندگی

ہونٹوں سے دبی بیڑی

زندگی کے بوجھ تلے دبی سچائی/ ایمانداری/ خلوص/ اپنان.....

انسان، انسان کہاں رہ گیا ہے؟

وہ تو بھاگا جا رہا ہے تیز دھوپ میں، بارش میں، ہانپتا ہوا کا پنتا ہوا منزل کا کوئی پتا نہیں ہم کون ہیں؟

ہماری پچپان/ ہمیں اس دھرتی پر کیوں بھیجا گیا/ ہم سب کدھر جا رہے ہیں/ ہم کچھ ہیں، تھی تو

ہیں کچھ نہ ہوتے تو بنائے کیوں جاتے؟؟

پڑا۔ مجھے باہر نکلتے دیکھ گھوش بابو، بار پنڈاجی اور اسکوٹھ اسٹینڈ میں کھڑے سارے کے سارے لوگ میرے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ آندھی کے تیز تھپڑوں نے ہم سب کو میٹرو ریلوے تک پہنچا دیا۔ ہم سب اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر رہے تھے کہ ہم سب زمین کے نیچے بنے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ لوگوں کا جھوم لوکل ٹرین کے انتظار میں کھڑا تھا۔

پلیٹ فارم پر جمع ہوتی ہوئی بھیڑ۔ سیڑھیوں سے اترتی گھبراہٹ، بے چینی اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ زمین کے اوپر آندھی اب بھی چل رہی ہے۔

میں بھی اور لوگوں کی طرح کمزور ہو چکا تھا آندھی کا مقابلہ نہیں کر سکا اور زمین کے اندر بھی ریلوے لائن پر چلنے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ چلتی گاڑی کے تجربے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ بغل والی سیٹ پر بیٹھے فادرور گیس بول رہے تھے انگریزی میں کہ شاید انہیں اپنی زبان اور اپنے سفید لباس سے بڑی محبت تھی۔ ٹرین میں سوار باقی لوگوں کو اپنی، اپنی تہذیب/زبان سے محبت ہے کہ نہیں معلوم نہ ہو سکا کہ فادر کے ساتھ سبھی لوگ انگریزی میں باتیں کرنے لگے۔ فادر بول رہے تھے۔

باقی ص نمبر ۳۳ پر...

رو میں کیوں بہہ رہا ہوں۔ میرے اندر الگ الگ چہرے کیوں ابھر رہے ہیں۔ کیوں ڈوب رہے ہیں؟ ڈوبتی، ابھرتی زندگی

لہر، لہر، زندگی لہریں زندگی کی علامت ہوا میں ہماری تہذیب کی نشانی مٹی ہوئی ہماری تہذیب/ہماری ثقافت/ہمارا کلچر تیز اٹھتی ہوئی ہوا میں

سر..... سر..... سر بہتی ہوا سائیں سائیں کرتی ہوا حیوانی اور نباتی زندگی بخشی ہوا انسان اور جانور کو اکھاڑ پھینکتی ہوا

سارے کے سارے لوگ دہشت زدہ اور مہبوت ہیں۔ خوف، دہشت، گھبراہٹ، اضطراب ہر ایک کے چہروں پر عیاں ہو رہا ہے۔ اس ہوا کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ ہوا تو ہماری زندگی کی علامت تھی۔ مگر آج یہ سب کچھ ختم کئے جا رہی تھی۔

میں پانچ سیڑھیاں نیچے اتر کر اسٹینڈ سے باہر آ گیا۔ آندھی اب بھی چل رہی تھی۔ آندھی کے رکنے کا انتظار کب تک کیا جاسکتا تھا۔ گھر میں بیوی، بچے بھی انتظار کر رہے ہوں گے۔ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ بیوی، بچوں کا خیال آتے ہی میں باہر نکل

ہوا میں ہمارے لئے رحمت ہوائیں ہمارے لئے ہلاکت کا سبب/ ہوائیں ہماری زندگی کی علامت

ان ہواؤں پر کس کا اقتدار ہے؟ ہوائیں، کبھی سرد، کبھی گرم۔ کبھی نہایت خوش گوار، کبھی تباہ کن آندھی/ طوفان/ ہوائیں ہمیں جلا سکتی ہیں/ ہوائیں ہمیں مٹا سکتی ہیں۔

ہم آگے بڑھ رہے ہیں، ہر آنے والا کل ہماری ترقی کی علامت ہے۔ ساری دنیا انٹرنیٹ میں سمٹ گئی ہے۔ مگر آندھی کا راستہ ہم روک نہیں سکتے۔ فطرت سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔

فطرت کہانی کہہ رہی تھی۔ فطرت کہانی سن رہی تھی۔ اور ہم اس کی کہانی میں مختلف رول ادا کر رہے تھے۔ ”قسم ہے ان ہواؤں کی جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں

پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں پھر ان کو پھاڑ کر جدا کرتی ہیں“ میرے اندر یہ کون بول رہا ہے۔ میں شعور کی

اودھ نمبر کتابی شکل میں

’نیادور‘ نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک ’اودھ نمبر‘ بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ نیادور





شہاب جعفری
۱۹۳۰ء - ۲۰۰۲ء

چلے تو پاؤں کے نیچے کچل گئی کوئی شے

نشے کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے



اپنی ڈھب کا انوکھا شاعر شہاب جعفری، ادبی حلقوں میں شاعری سے زیادہ ان کی شخصیت ہمیشہ توجہ کا مرکز بنی رہی۔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے لیکن انہوں نے بڑی بیباک غزلیں بھی کہیں۔ ان کی نظموں میں سورج، چاند، سمندر، پانی، پتھر اور ہوا جیسے الفاظ کا استعمال بطور استعارہ کیا گیا ہے اور علامت سازی کا انداز بھی منفرد ہے لیکن سورج اور اس کے دیگر تلامزات ان کی شاعری کا کلیدی موضوع ہے۔ ایک ہی مجموعہ کلام کے شاعر اور اس کا کا نام سورج کا شہر۔ شہاب جعفری کی زیادہ تر نظمیں اور اس کے بیانیہ کونثری اصطلاح سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے حالانکہ ان کا بیانیہ بہت ہی مضبوط اور تہہ دار ہے جو کہ مدت تک موضوع بحث رہا۔

ان کی شاعری دانشورانہ فکر سے بھرپور ہے اور انہوں نے ہر اس مقام پر لوہا لینے کی کوشش کی ہے جہاں سے عام طور پر لوگ بچ کر نکل جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے آئے ہیں۔ ان کی شاعری خون میں گرمی پیدا کرتی ہے۔ یہی ان کی شاعری کا سب سے بڑا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی اصطلاحیں اور نئی تراکیب کو گڑھنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے مروجہ الفاظ کو ایک نیا آہنگ عطا کیا۔ ادارہ نیادور کی جانب سے شہاب جعفری کے ۸۸ ویں یوم ولادت کے موقع پر پیش ہے ان کی دو غزلیں اور ایک نظم

شہرِ انا میں

غزل

یہ تیز دھوپ یہ کاندھوں پہ جاگتا سورج
زمین بلند ہے اتنی کہ آسمان کی رقیب
وہ روشنی ہے وہ بیداریاں کہ سائے نہ خواب
بس ایک ہوش بس اک آگہی بس اک احساس
اور ان کے نور سے جلتے بدن گھٹکتے بدن
بدن ہیں کھولتے سیال آئینے ہر سو
ہر آن بپتے سداہینتیں بدلتے بدن
دماغ دور سے ان کا نظارہ کرتا ہے
اور ان کے قرب کے اظہار سے سنورتا ہے
وہ روشنی ہے کہ از فردتا بہ فرد تمام
کسی کی شکل نہ صورت کسی کا رنگ نہ روپ
تمام نفس و آفاق گم ہیں آپس میں
ہیں فرد فرد کی پرچھائیاں بھی دھوپ ہی دھوپ
سب اپنے علم کا جادوئے سامری لے کر
ہزار آنکھوں سے اک دوسرے کو دیکھتے ہیں
رواں دواں ہیں سب اک دوسرے کو دیکھتے ہیں
اور اتنا جان چکے ہیں سب ایک دوسرے کو
کچھ اتنی دور نکل آئے ہیں سب اپنے سے
کہ دل کے رشتوں کو اب مانتا نہیں کوئی
کسی کو اپنے سوا جانتا نہیں کوئی

اس دھوپ سے کیا گلہ ہے مجھ کو
سائے نے جلا دیا ہے مجھ کو
میں نالہ سکوت سنگ کا ہوں
صحرا نے بہت سنا ہے مجھ کو
میں لفظ کی طرح بے زباں تھا
معنی نے ادا کیا ہے مجھ کو
ہر سچ کا نصیب سنگ ساری
اور سچ ہی سے واسطہ ہے مجھ کو
خائف نہیں مرگ ناگہاں سے
جینے کا وہ حوصلہ ہے مجھ کو
پتھر پہ مری صدا کا سایہ
آئینہ دکھا رہا ہے مجھ کو
آواز دے مجھ کو تیرگی میں
آواز ہی نقش پا ہے مجھ کو

غزل

قید اماں سے تمنا تھی گئیں چھوٹ گئی
پاؤں ہم نے جب اٹھایا تو زمیں چھوٹ گئی
لیے جاتا ہے خلاؤں میں جمال شب و روز
دن کہیں چھوٹ گیا رات کہیں چھوٹ گئی
زندگی کیا تھی میں اک موج کے پیچھے تھارواں
اور وہ موج کہ ساحل کے قریں چھوٹ گئی
بود و باش اپنی نہ پوچھو کہ اسی شہر میں ہم
زندگی لائے تھے گھر سے سو یہیں چھوٹ گئی
دل سے دنیا تک اک ایسا ہی سفر تھا جس میں
کہیں دل اور کہیں دنیائے حسین چھوٹ گئی
صبح دم دل کے مکاں سے سبھی رشتے ٹوٹے
در و دیوار سے فریاد مکیں چھوٹ گئی
کیا غریب الوطنی سی ہے غریب الوطنی
آسماں ساتھ چلا گھر کی زمیں چھوٹ گئی

A PERSON TRAVELLING BY PASSENGER TRAIN CONSCIOUSLY OR UNCONSCIOUSLY EXPERIENCES MANY THINGS, WHICH ARE THOUGHT PROVOCATING AND LEAVES NUMBER OF LESSONS FOR U S . A VERY COMMON EXPERIENCE IS THAT WHEN THE TRAIN MOVES FAST THE PASSENGERS SITTING INSIDE ITS COMPARTMENT FEEL THEMSELVES STATIC, WHILE EVERYTHING OUTSIDE THE WINDOW LOOKS TO BE FAST RUNNING IN THE OPPOSITE DIRECTION. THIS GIVES US BITTER EXPERIENCE OF LIFE ALSO."

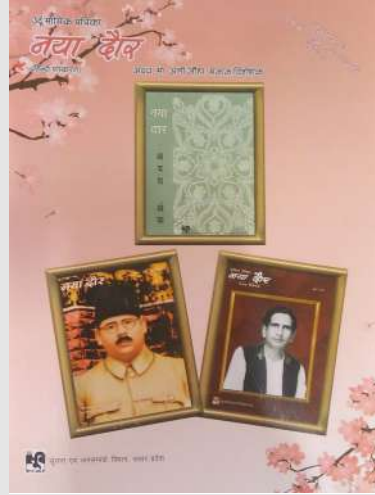
میں نے فادر گیس کی باتوں کا جواب اپنی مادری زبان میں دیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ لوکل ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں ہمارے ملک کی الگ الگ زبان میں الگ تہذیب سمٹ کر بیٹھ گئی ہو۔

ٹرین تیز رفتاری سے آگے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ شیشے کی کھڑکیاں اور دروازے سبھی بند تھے۔ کش مکش۔ معنی کی تلاش۔ افسردگی اور میں!

ہر پلیٹ فارم پر ٹرین رکتی ہے اور ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ لوگ تیزی سے اندر داخل ہوتے ہیں۔ افراتفری سی مچ جاتی ہے اور پھر ٹرین چلنے لگتی ہے کہ شاید رفتار کا مسئلہ حل ہو رہا ہے۔ زندگی ایک سفر ہے اور سفر زندگی کی علامت۔ مجھے مسلسل سفر میں رہنا چاہئے۔ مگر یہ میرے اختیار میں نہیں۔ ٹرین آخری اسٹیشن پر رک چکی تھی۔ میں باہر نکل آتا ہوں زمین کے

اندرون سے باہر کے فٹ پاتھ پر! آندھی تھم چکی تھی اور انسان حرکت میں آچکے تھے۔ سہوں کے قدم اپنے اپنے گھروں کی طرف

نیادور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں



'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کورئیر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ نیادور

بڑھ رہے تھے۔

سوکھے پتے آندھی اور طوفان کا مقابلہ کیوں نہیں کر پاتے؟

درختوں کی شاخیں الگ کیوں ہو جاتی ہیں
صنوبر کا بیڑا اپنی جڑوں سے الگ کیوں ہو جاتا
ہے/ ہری، ہری نرم گھانسیں سجدہ میں کیوں چلی جاتی
ہیں؟

کچے مکانون کی چھتیں کیوں اڑ جاتی ہیں؟

کمزور عمارتیں کیوں گر جاتی ہیں

ملا بخش سہوں کی مرادیں پوری کرنے والا

کیوں بن جاتا ہے۔

ہرے بھرے درخت جو زہریلی گیس کو اپنے

اندروں جذب کرتے ہیں، فضائی آلودگی کو کم کرتے ہیں،

وہ درخت جو آکسیجن ہمیں مفت بانٹا کرتے

ہیں۔ آندھی، ان کے بازوؤں اور ان کی جڑوں کو

تلوار کی تیز دھار بن کر کیوں کاٹ ڈالتی ہے۔ طوفانی

ہوا تھم چکی تھی۔ مگر مجھے اپنے پاؤں زمین سے اکھڑتے

ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ

میں اپنی بنیاد سے جدا ہو کر ایک طرف جھک

گیا ہوں۔ لمبی چوڑی سڑک کے کنارے کھڑی ان

اونچی عمارتوں کی طرح جو اپنی بنیاد سے الگ ہو کر

دائیں جانب جھک گئی تھیں۔ ٹیلی فون کے ان کھبوں

کی طرح جنہیں طوفانی ہوائے ایک طرف جھکا دیا

تھا۔ فٹ پاتھ کے کنارے روتی ہوئی انسانیت کی

طرح جو تڑپ تڑپ کر دم توڑ چکی تھی۔ آندھی آئی اور

چھوڑ کر چلی گئی۔ روتی دم توڑتی انسانیت کی تاریخ!

زندگی دھیرے دھیرے معمول پر آنے لگی تھی۔ سفید

پڑ چکے چہرے پھر سے رنگین ہوتے جا رہے تھے۔

لوگوں کے دلوں سے آندھی کا خوف نکل چکا تھا۔ بچے

ہوئے درخت پھر سے تن کر کھڑے تھے۔ جیسے یہ

آندھی پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے گی۔

مگر طوفانی ہوا تو چلتی رہے گی۔ آندھی تو آتی

رہے گی۔ زمین زلزلوں سے ہلائی جاتی رہے گی کہ

سورج ابھی جاگ رہا ہے۔

□□□

بچپن کا ایک خواب



پروفیسر شرمیستھا

فلیٹ نمبر 4/48، NCERT، کیمپس، شری اربندو
مارگ، نئی دہلی، موبائل: 9910782964

سدرہ نے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا اور آج اُسے اس کے خواب کی تعبیر مل گئی تھی۔ اس کا سپنا سچ ہو گیا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے ذہن کا پرندہ حال کی قید سے آزاد ہو کر ماضی کے کھلے آسمان میں اپنے پنکھ پھیلائے محو پرواز ہو گیا تھا ...

”میں آئی اے ایس بنوں گی!“

شیم سر کے جواب میں اُس نے کہا تھا۔

اُسے یاد آیا ...

جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُس وقت اردو کی کلاس میں پنڈت سے ایک نئے ٹیچر آئے تھے۔ اُن کا نام تھا سید محمد شیم۔ اُنھوں نے سبھی طالب علموں کے تعارف مکمل ہونے کے بعد باری باری سے دریافت کیا تھا کہ ہم بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں۔ زیادہ تر بچوں نے اپنے جواب میں کہا تھا۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔ میں انجینئر بننا چاہتا ہوں۔ کسی نے کہا میں ٹیچر بننا چاہتی ہوں۔ کسی نے فوج میں بھرتی ہو کر ملک کی حفاظت کرنے کی خواہش ظاہر کی تو کسی نے وکیل بن کر لوگوں کو انصاف دلانے کی آرزو ظاہر کی۔ کچھ بچوں نے نیتا بننے کی خواہش کا اظہار کیا، اس پر سبھی ہنس پڑے تھے۔ شیم سر بھی سن کر ہنسنے لگے تھے۔ لیکن جب میری باری آئی تو میں نے بڑی متانت سے کہا۔

”میں آئی اے ایس بننا چاہتی ہوں!“

میرا جواب سن کر سبھی بچے سنجیدہ ہو گئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ آئی اے ایس کے بارے میں بہت کم بچوں نے سُن رکھا تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اس کے

بارے میں بچوں کو بالکل بھی معلومات نہیں تھی، تو غلط نہ ہوگا۔ شیم سر نے مجھ آئی اے ایس کا فائل فارم بتانے کو کہا تو میں نے بلا توقف بتا دیا۔

انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس۔

شیم سر نے فوراً اُس کی وضاحت کی اور پوری کلاس کو مخاطب کر کے سمجھایا کہ انگریزوں نے حکومت کے کام کاج چلانے کے لیے سول سروس کا امتحان شروع کیا تھا۔ دو رنگلامی میں جو ہندوستانی اس امتحان کو پاس کر لیتے تھے، اُن کی سول سروس کے تین شعبوں میں سے کسی ایک میں ترقی کر لی جاتی تھی۔

شیم سر نے اس کے تینوں شعبوں کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس، اینڈین پولس سروس اور اینڈین فورین سروس جن کو شارٹ فارم میں بالترتیب آئی اے ایس، آئی پی ایس اور آئی ایف ایس کہا جاتا ہے۔ ہمارے آزاد ملک میں اس کا امتحان ہر سال یونین پبلک سروس کمیشن کراتی ہے۔ اس یو پی ایس کے امتحان کے تین حصے ہوتے ہیں۔ پریلیم ٹیسٹ، مینس امتحان اور انٹرویو۔

ایسے امیدوار جو معلومات عامہ، منطق اور ریاضی کے معروضی سوالات پاس کر لیتے ہیں، انھیں مینس میں اپنے سات مضامین سمیت کسی دو اختیاری مضامین کے وضاحتی امتحانات پاس کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد انٹرویو کی باری آتی ہے جس میں امیدواروں کے شخصی اوصاف جاننے کے لیے انٹرویو بورڈ کے ارکان مختلف طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ اگر

امیدوار نے اپنی حاضر دماغی، ہوشیاری، دیانت داری اور عقلمندی کے ساتھ بورڈ کو مطمئن کر دیا تو ان میں سے بہترین امیدواروں کا انتخاب عمل میں آجاتا ہے۔ اس طرح ایک گریجویٹ جس کی عمر اکیس سے کم اور تیس سال سے زیادہ نہ ہو وہ سول سروس کے مقابلہ جاتی امتحان میں شرکت کر سکتا ہے۔

سدرہ نے جس دن بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا، اُس دن سے وہ یو پی ایس کی معلومات جٹانے میں سنجیدگی سے لگ گئی تھی۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ اس امتحان کو پاس کرنے کے لیے کسی بھی امیدوار کو کل چھ موقعے دیے جاتے ہیں تو اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا تھا۔ اُس نے مزید جانکاری حاصل کی تو پتہ چلا کہ اس امتحان کے لیے ہر سال جنوری فروری میں انٹرنیٹ کے ذریعے upsc.gov.in کی ویب سائٹ پر جا کر فارم آن لائن بھرا جاتا ہے۔ پریلیم ٹیسٹ پاس کر لینے کے بعد عموماً جون کے مہینے میں مینس کے وضاحتی امتحانات کے لیے بلا یا جاتا ہے۔

سدرہ کو سب سے زیادہ خوشی یہ جان کر ہوئی تھی کہ وہ مینس کے وضاحتی امتحانات اپنی مادری زبان اردو کے ذریعے بھی دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اُسے صرف ایک پیپر انگریزی کا بھی پاس کرنا لازمی ہوگا۔ امتحان کی تیاری کے دو سال اتنی طوفانی رفتار سے گزر گئے تھے کہ سدرہ کو کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ آج وہ نشاط انگیز لمحات موسم باراں کی بجلی کی طرح رہ رہ کے

تھی۔ وہ بہت پُر امید تھی کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب آئی اے ایس آفیسر بننے سے اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔

سدرہ کی والدہ اس کے کھانے پینے کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ صبح پانچ بجے اُٹھ کر جب وہ مطالعہ شروع کرتی تو اس کی والدہ اس کی میز پر ایک گلاس گرما گرم دودھ رکھ دیا کرتی تھیں۔ اُسے کبھی سوچنا نہیں پڑا کہ آج وہ کون سا کپڑا زیب تن کرے گی۔ اس کی والدہ ہمیشہ اس کے پہننے اوڑھنے کا پورا بندوبست کر دیا کرتی تھیں۔

جب اُس نے پرلیم ٹیسٹ میں کل دو سو میں سے ایک سو اسی مارکس حاصل کر لیے تو اس کے اندر یکا یک خود اعتمادی پیدا ہو گئی اور اسے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اب اپنی منزل سے بس ایک قدم دور رہ گئی ہے۔ اب اسے پوری تندہی اور انہماک کے ساتھ اگلے سفر کی تیاری یعنی مینس امتحانات کی تیاری کرنی تھی۔ اس بار اُسے پرلیم ٹیسٹ کے برخلاف تفصیلی مضمون لکھنے اور وضاحتی سوالات حل کرنے کی مشق کرنی تھی۔ سدرہ نے بیک وقت کئی کئی اخبارات کے ایڈیٹریل پیج پڑھنے شروع کر دیے تھے جس سے آتشیں مسلوں کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھنے پر کھنے کی مشق ہو جاتی تھی۔ سدرہ نے تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات کے ساتھ ایک پیپر اردو ادب کا بھی رکھا تھا۔ ہر موضوع پر اُس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ خاص کر کے اردو ادب کی تاریخ اُسے اچھی طرح ازبر ہو گئی تھی۔ شخصی ٹیسٹ کے لیے اُسے الگ سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کیونکہ بچپن سے ہی وہ بہت مثبت رویے اختیار کرتی آئی تھی۔ کبھی کسی نا مساعد حالت سے ہار ماننا، اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک ضد تھی جو اُس نے دل میں ٹھان لیا، اُسے کسی بھی طرح وہ پورا کر کے ہی چھوڑتی تھی۔

وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ جب اُس نے مینس کے امتحانات بھی ساڑھے سترہ سو میں سے چودہ سو تیس

مرکزی اور ریاستی حکومتیں کس طرح پالیسیاں وضع کرتی ہیں۔ لیکن ان منصوبوں اور پالیسیوں کو نافذ کرنے میں ان ہی آئی اے ایس آفیسروں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

سدرہ کو اپنے خالو جان سے کافی ترغیب ملی تھی۔ اس کے خالو ضلع مجسٹریٹ تھے۔ انھوں نے بھی اپنے زمانے میں سول سروس کا مقابلہ جاتی امتحان پاس

ساتی فاروقی



’پاپ بیٹی‘ ہو یا ان کی دوسری تخلیقات، ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ ساتی فاروقی کچھ لکھیں اور عالمی پیمانے پر سرخیوں میں نہ آئیں۔ ساتی فاروقی کی ۸۲ ویں سالگرہ کے موقع پر ستمبر ۲۰۱۸ء کا ’نیا دور‘ ساتی فاروقی پر مبنی ہو گا جس میں **بیدار بخت، اسد محمد خان، مشرف عالم ذوقی، زمر مدغل** وغیرہ کے مضامین شامل ہوں گے۔

کیا تھا۔ اُن کی تعلیم بی اے، ایل ایل بی کی تھی۔ پھر سدرہ کی زندگی میں وہ خوب صورت لہجہ بھی آیا جب اُس نے بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا اور پوری ریاست کے تعلیمی بورڈ میں اسے اول پوزیشن ملی تھی۔ اپنے اتنے اچھے ریزلٹ سے اس کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی

اس کے ذہن پر کوند رہے تھے، اسے وہ انتہائی مسرور کن لہجہ یاد آ رہا تھا، جب اس نے یو پی ایس سی کی ویب سائٹ پر اپنا ریزلٹ دیکھا تھا۔ کامیاب امیدواروں کی فہرست میں اوپر سے اس کا نام دسویں نمبر پر تھا۔ اُس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس کا سر خود بخود سجدہ شکر میں جھک گیا تھا۔

بہت ہی غربت میں اس نے ابتدائی زندگی بسر کی تھی۔ لیکن گھر میں تعلیم کا ماحول تھا۔ اس کے والد مشتاق صاحب کسی کالج کے لائبریرین تھے۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا، ہر وقت اپنے والد کو مطالعہ میں غرق پایا تھا۔ اسے خود بھی مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ ہر طرح کی اچھی اچھی کتابیں اس کی شخصی لائبریری اور مطالعہ کے ٹیبل پر موجود رہتی تھی۔ اپنے کبھی بھائی بہنوں میں وہ سب سے چھوٹی تھی۔ اس سے بڑے دو بھائی تھے اور ایک بڑی بہن تھی۔ لیکن ماں باپ کی وہ لاڈلی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی جماعت میں وہ ہر سال اول آتی تھی۔

اُسے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب اُس کے خالو جان نے اُسے بتایا تھا۔ جمہوری نظام حکومت میں سیاسی جماعتیں انتخاب میں جیت حاصل کر کے حکومت سازی کرتی ہیں۔ لیکن اصل میں حکومت کے احکامات کا اطلاق آئی اے ایس آفیسر کے ذریعے پائے تکمیل کو پہنچتا ہے۔ حکومت چلانے کے لیے وزیر ہنمائی کرتے ہیں کہ ملک کو کس طرح ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ حکومت کے احکامات کو عملی جامہ پہنانے میں ہماری انتظامیہ، جوڈیشری، قانون ساز اسمبلی اور محکمہ پولیس مدد کرتی ہے۔

سدرہ آفرین کو اپنے خالو کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی کہ کس طرح انھوں نے مزید وضاحت کے ساتھ اس کے شبہات دور کیے تھے۔

نظام تعلیم، صحت عامہ، شہر کاری، صنعت کاری، ذراعت اور ملازمت وغیرہ کے مختلف شعبوں میں

مارکس کے ساتھ پاس کر لیے تھے۔

اللہ اللہ کر کے وہ بھی دن قریب آ گیا جب اُس نے یو پی ایس سی کا انٹرویو دیا۔ انٹرویو کے لیے اُس نے اپنا پسندیدہ موضوع پیڈ میڈیا یعنی بکاؤ ذرائع ترسیل رکھا تھا۔ موجودہ دور کے پرائیویٹ میڈیا پر اس کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ کوئی بھی خبر ہو بغیر تحقیق کے آسانی سے قبول نہیں کرتی تھی۔ آج اللہ نے آخر وہ دن بھی نصیب کر دیا جس کا بڑی بے صبری سے انتظار تھا۔ اُس کے گھر کے آنگن میں ہر طرف جشن کا ماحول تھا۔ یہ نظارہ دیکھتے ہی بنتا تھا۔ اس کے والدین اور سبھی بھائی بہن اُسے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اُس نے نا جانے کتنی پشتوں کے بعد خاندان کا نام روشن کیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔

پیڈ میڈیا کے سوال پر انٹرویو بورڈ کے سامنے اُس نے جس طرح سے اپنا موقف رکھا تھا۔ اس پر سبھی نے اس کی خوب ستائش کی تھی اور ٹیبل چھتھپکا کے اسے شاباشی دی تھی۔

جیسے جیسے دن ڈھلتا گیا، لوگوں کو خبر ملتی گئی اور شام ہوتے ہوتے، اچھی خاصی بھیر اٹھی ہو گئی تھی۔ قرب و

جوار میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ٹی وی کے لیے کچھ نیوز چینل کے رپورٹر سدرہ آفرین سے انٹرویو لیے رہے تھے، اخبارات کے ترجمان و نامہ نگار اس سے متعلق سوالات پوچھ رہے تھے اور کچھ ٹی وی صحافی اس کی تصویریں لے رہے تھے۔ وہ اپنی کمیونٹی کی نمائندگی کر رہی تھی۔ ایسے سماج میں جہاں لڑکیوں کی یہ نسبت لڑکوں کو ہر بات پر ترجیح دی جاتی ہے، اُس ماحول میں رہ کر آپ نے کیسے یہ مقام حاصل کر لیا۔ اس کے لیے آپ کو کتنی جدوجہد کرنی پڑی؟ اسی قبیل کے مختلف سوالات اس سے پوچھے جا رہے تھے۔

سدرہ ہر سوال کا بڑی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ جواب دیتی جا رہی تھی۔ کیونکہ اس کی زندگی کی یہ تلخ حقیقت تھی۔ اُس نے بہت غربتی سے اٹھ کر یہاں تک کا تنہا سفر طے کیا تھا۔ سماج میں ایک مقام حاصل کیا تھا، جس سے اس کا پورا خاندان فخر سے سراٹھا کے چلنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی سدرہ آفرین کی آنکھیں مارے خوشی کے نم ہو گئیں۔

تجھی دل کے نہاں خانے سے آواز آئی۔
دیکھو، لوگو! میں نہ کہتی تھی۔

”آج میں آئی اے ایس آفیسر بن گئی!“

اس خیال کے آتے ہی سدرہ نے فرط جذبات سے لہریز ہو کر یکا یک اپنی دونوں آنکھیں بھینچ لیں۔ تبھی سدرہ کی والدہ نے سامنے سے آکر اسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا۔ وہاں موجود لوگوں نے دیکھا، اس وقت متنا کے جذبے سے شرابور ایک ماں اپنی بچی کو کیسے اپنے سینے سے لگا کر پیار سے اس کی پیٹھ تھپک رہی تھی۔ یہ انسانی جذبات و احساسات کا درجہ منتہا تھا جہاں پہنچ کر دونوں ماں بیٹی کی آنکھوں سے گنگا و جمن جا رہی تھی۔

اور پھر، دیکھتے ہی دیکھتے، ان کے ارد گرد جمع بھیڑ نے انھیں خوشی و انبساط کے عالم میں دبھیں تنہا چھوڑ دیا اور پھر کچھ ہی دیر میں وہاں سے سبھی اپنے اپنے رستے چل دیئے۔

شام کا دھندلکا اب دھیرے دھیرے پھیلنے لگا تھا اور دور مشرقی افق پر پور نیایشی کا تازہ دم چاند اپنے نئے سفر کے آغاز کے لیے بڑے آب و تاب کے ساتھ اپنا رخت سفر باندھ رہا تھا۔

□□□

اردو زبان کا سیکولر کردار (حصہ اول)

دوسری زبانوں کے مقابلے اردو میں سیکولرزم کی پختہ روایت پر پروفیسر مشیر الحسن کا مقالہ

اردو کے مشہور و معروف شاعر انور جلاپوری کی شخصیت اور فن پر وسیم بریلوی، نواز دیوبندی،

منور رانا، افتخار امام صدیقی، مولانا عبدالعلی فاروقی، خوشبیر سنگھ شاد، سنجے مصر اشوق،

شفیع جاوید، احتشام افسر، شہریار وغیرہ کے مضامین اور بھگوت گیتا کے منظوم ترجمے کے اقتباسات

اب جولائی ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔

اس کے علاوہ ہندوستانی زبانیں، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر تخلیقات

غزل

شہرِ طلب میں آئے ہو تو رونا دھونا مت کرنا
جن پلکوں پر خواب سجے ہیں اُن کو رسوا مت کرنا
اپنے آپ سے جنگِ بہت کی ہارے بھی اور جیتے بھی
اک دن مجھ سے دل نے کہا تھا اپنا سودا مت کرنا
جانے کتنے عکس ملیں گے کتنے منظر و نظر بھی
راہِ طلبِ شاداب بہت ہے اس کو صحرا مت کرنا
اپنوں کی سوغات یہی ہیں دل پر ہوں یا روح پہ ہوں
ان زخموں کو تازہ رکھنا ان کو اچھا مت کرنا
دیکھو اس آباد خرابے میں بھی کتنی رونق ہے
میرے حال پر رونے والو! دل کو چھوٹا مت کرنا
اپنی آنکھیں کھول کے چلنا شہر ہے یہ سفاک بہت
اُس کی یادیں ساتھ میں رکھنا خود کو تنہا مت کرنا
میں تو ضیا ہر حال میں خوش ہوں، حاصل کیا لا حاصل کیا
مجھ سے نسبت رکھنے والو! تم بھی تماشہ مت کرنا

ضیاء فاروقی

10-H-K, MHKITC، رفیقہ اسکول روڈ، بھوپال
موبائل: 9406541986

غزل

خوش نہیں ہے کوئی بس یہ ہے کہ پردا رہ گیا
وہ بھی آزرده ہے کٹ کر میں بھی تنہا رہ گیا
تشنہ لب اپنے سراپوں کی طرف بڑھتے رہے
پتھروں کی اوٹ میں چشمہ اکیلا رہ گیا
اس افق سے اس افق تک دھوپ میری مملکت
تیرے قبضے میں بس اک سائے کا ٹکڑا رہ گیا
دونوں جانب سے چلے پتھر، کئی پکڑے گئے
جس پہ ہنگامہ تھا وہ بچہ بلکتا رہ گیا
سب عناصر قتل کر کے بھاگنے والوں میں تھے
میری مٹھی میں ہوا کا ایک جھونکا رہ گیا
چاندنی تقسیم کی جائے گی دو دن صبر کر
اور اگر ان دو دنوں میں چاند آدھا رہ گیا
اے مظفر لے گئی دریا کو وحشت کھینچ کر
دونوں ہاتھوں سے زمیں پکڑے کنارہ رہ گیا

مظفر حنفی

اے۔آئی۔ایم۔ایس۔اپارٹمنٹ، میورکنج، میورہار، دہلی
موبائل: 9717581666

غزل

نہ التماس و گزارش نہ التجا ہے کوئی
نہ کوئی حرف دعا ہے نہ مدعا کوئی
کوئی شکایت و شکوہ بھی ہے تو خود سے ہے
فریب وقت سے ہرگز نہیں گلہ کوئی
لباس روح میں احساس لمس چھوڑ گیا
کچھ اتنے پاس سے ہو کر گزر گیا کوئی
یہ واقعہ بھی عجب ہے کہ قتل نور کے بعد
دھواں پکارتا ہے بچھ گیا دیا کوئی
انہیں بھی ترک مراسم سے اک ضرر پہنچا
کہ چاہ کر بھی نہ دے پائے غم نیا کوئی
وہ ایک دور کی آواز سب پہ چھائی رہی
بہت قریب سے دیتا رہا صدا کوئی
فصیل ضبط پہ رکھا ہوا چراغ ہوں میں
بجھا نہ پائے گی ہرگز مجھے ہوا کوئی

باقر مہدی

فرسٹ فلور، R-127/A، جوگابائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی
موبائل: 9313144221

غزل

جلوہ فرما وہ لبِ بام نہیں ہو سکتا
اُس کا نظارہ کبھی عام نہیں ہو سکتا
ماہِ کامل نظر آتا ہے ہمیشہ شب میں
وہ نمودار سرِ شام نہیں ہو سکتا
جو فقط عشقِ حقیقی سے سروکار رکھے
ایسا عاشق کبھی بدنام نہیں ہو سکتا
متحد ہو کے اگر امن سے سب لوگ رہیں
کوئی منظر لہوِ آشام نہیں ہو سکتا
شاعری کو مری پیغمبری سمجھے نہ کوئی
شعر تو شعر ہے، الہام نہیں ہو سکتا
بادہ نوشی سے علاجِ غمِ دل کیا ہوگا
اس لئے غرقِ مے و جام نہیں ہو سکتا
خونِ دل جس نے دیا کشتِ سخن کو مخمور
وہ ادب میں کبھی گننام نہیں ہو سکتا

مخمور کا کوری

68 چودھری محلہ، کاکوری، لکھنؤ
موبائل: 9450097929

غزل

وہ آئے میرے خواب میں تاخیر کے بغیر
میں خوش ہوں ان کی کاغذی تصویر کے بغیر
وہ مطمئن نہیں رہا ایام کیف میں
کیا چین آئے عشق کو زنجیر کے بغیر
ان کی ادائے ناز رہے دل کھینچ کر فرار
تاثیر کن رہی وہ کسی تیر کے بغیر
ہے اس کے حرف حرف میں پیچیدگی نہاں
سمجھو گے کیسے شوخ کو تفسیر کے بغیر
منطق سے فلسفہ سے دو موقف کا تم ثبوت
منزل کو کیسے پاؤ گے تدبیر کے بغیر
مال و متاع سب چلے جائیں تو غم نہیں
سالم رہے گا کیسے تو توقیر کے بغیر
انجام عینی وہ رہے علم عروض سے
تھا ان کا تبصرہ کسی تاثیر کے بغیر

سید خادم رسول عینی

چیف میجر، یونین بینک آف انڈیا، گومتی نگر، لکھنؤ
موبائل: 7506203515

غزل

خواب آنکھوں میں تم اس طرح سجایا نہ کرو
دل یہ کہتا ہے کہ اتنا بھی بھروسہ نہ کرو
کچھ زمانے کی نگاہوں میں تو رہنے دو بھرم
ہر گھڑی اپنی محبت کا تقاضا نہ کرو
اپنے الفاظ کا پتھر نہ چلاؤ مجھ پر
شیشہ دل مرا اس طرح سے توڑا نہ کرو
وعدہ کرتے ہو تو قائم بھی رہو وعدوں پر
راہ چلتے ہوئے اب ہم کو جلایا نہ کرو
اس طرح دیکھ کے اے جان لرز جاتی ہوں
دل کی دنیا میں دبے پاؤں تم آیا نہ کرو
تم اگر ترک وفا کر بھی چکے ہو تو سنو!
میری جانب کبھی اب مڑ کے بھی دیکھا نہ کرو
ٹوٹ کر چاہو مری طرح سے تم بھی نشاط
مری آنکھوں میں رہو اور ستایا نہ کرو

نشاط فاطمہ

سبزی باغ، پٹنہ
موبائل: 7543978955

غزل

وہ آسماں ہے تو ہو میں زمین ہوں خوش ہوں
انا کے شہر میں جب سے مکین ہوں خوش ہوں
یہ جانتی ہوں کہ رہتے ہیں سانپ اس میں مگر
ابھی بھی پہنے وہی آستین ہوں خوش ہوں
خزاں کے دشت میں جشن بہار بھی ہوگا
نہ جانے کس لئے یوں پُر یقین ہوں خوش ہوں
سنا ہے چھوڑ کے مجھ کو وہ کچھ اداس سا ہے
میں اس کی یاد کی اب تک امین ہوں خوش ہوں
زمانہ ظاہری صورت میں عیب ڈھونڈتا ہے
مجھے گماں ہے کہ دل سے حسین ہوں خوش ہوں
وہ آفتاب ہے چرچا ہے چار سو اس کا
میں اک چراغ ہوں گوشہ نشین ہوں خوش ہوں
درِ خدا کے سوا جو کبھی کہیں نہ جھکی
حتا ہے شکرِ خدا وہ جبین ہوں خوش ہوں

حتا رضوی حیدر

174-C، درگاہ دیوی مارگ، نزدیکی پروا، حسین آباد، لکھنؤ
موبائل: 7800313410

غزل

کمان توڑ دی اپنی زرہ اتار چکا
خوشی مناؤ مرے دشمنو میں ہار چکا
اداس بیٹھی ہیں صحرا نوردیاں میری
میں اپنے آپ کو ہر دشت میں پکار چکا
میں قرضدار ہوں لوگوں مجھے ذلیل کرو
نہ قرض یار چکا اور نہ قرض دار چکا
بچا رکھا تھا جو اک تیر اس جہاں کے لئے
وہ ایک تیر میں سینے میں اپنے مار چکا
ہیں اور کام مجھے زندگی اجازت دے
میں تیری زلف پریشاں بہت سنوار چکا
کوئی حساب تھا تا عمر چک نہیں پایا
وہی حساب جو ہر روز بار بار چکا

امیر امام

نمبردار ہاؤس، نوریوں سرائے، سنہیل
موبائل: 8755593144

غزل

فصل گل ایسی نہ تھی بادِ صبا ایسی نہ تھی
آج سے پہلے زمانے کی ہوا ایسی نہ تھی

یہ لباس گل بھی نظم گلستاں ایسا نہ تھا
سرخِ رنگ شفق بوئے حنا ایسی نہ تھی

مہرباں جس پر ہوئی اس کی بجھا دی تشنگی
میرے گھر پر جو برستی وہ گھٹا ایسی نہ تھی

آج ہم نے سچ کہا تو سب مخالف ہو گئے
ورنہ یہ دنیا کبھی ہم سے خفا ایسی نہ تھی

عبدالمنان صدیقی

مکان نمبر 2939، نگلہ ملاہ، کوئٹہ، علی گڑھ
موبائل: 9286300994

غزل

درد ہونٹوں کے تبسم سے عیاں تک نہ ہوا
جل گیا خانہ احساس دھواں تک نہ ہوا

سازشیں رچتے رہے قتل کی میرے مرے دوست
ہائے افسوس مجھے ان پہ گماں تک نہ ہوا

کر گیا مجھ کو یوں گمنام نشہ شہرت کا
بعد مرنے کے مرا نام و نشان تک نہ ہوا

اس کو آداب محبت کے کوئی سکھلا دے
مرا محبوب مرا دشمن جاں تک نہ ہوا

زندگی نے تو کئے لاکھ ستم مجھ پہ مگر
ایک آنسو مری آنکھوں سے رواں تک نہ ہوا

خود کی دو گز کی زمیں اس کو میسر نہ ہوئی
مر گیا خانہ بدوش اپنا مکاں تک نہ ہوا

تری الفت تو بس اک حد میں ہی محدود رہی
تری خاطر یہ مرا عشق کہاں تک نہ ہوا

سید محمد عسکری عارف

کنگھڑ کمال، سلطان گڑھ، امبیڈ کرنگر
موبائل: 9005889955

تعلیم و تربیت اطفال



مرزا جعفر حسین

۱۸۹۹ء ۱۹۸۹ء

دودھ بڑھائی کے بعد ان تو جہات پر اور زیادہ پابندی ہوتی تھی۔ نمک چشی کے بعد غذاؤں پر آمادہ کرنے کی فکر ہو جاتی اور ایک سال کی عمر تک پہنچ جانے کے بعد ہر ملزم خدمت گزار بات کرنا سکھاتی تھی۔ اس تعلیم میں مادر گرامی بھی شریک کار رہتی تھیں۔ نگرانی بھی فرماتیں اور خود بھی بات کرنا سکھاتی تھیں۔ سب سے بڑا رکھ رکھاؤ یہ تھا کہ محل کے اندر یا باہر بچے کے کان میں کوئی فحش کلمہ یا بدہنسی کی بات نہ پہنچ سکے۔ پرہیز اور احتیاط بچوں کی تربیت میں سب سے زیادہ اہم ضرورت تھی اور اسی ضرورت کو پورا کر کے بچے کو مہذب اور شائستہ بنا دیا جاتا تھا۔

تربیت کا یہ طریقہ بھی قابل ذکر ہے کہ الفاظ یا عمل سے بچے کو کسی بات سے بھی ٹوکا یا روکا نہیں جاتا تھا بلکہ یہ فکر رہتی تھی کہ بچہ خود ہی کسی نامناسب یا غلط حرکت کی طرف آمادہ نہ ہو۔ یہی عدم آمادگی بلندی کردار کا سنگ بنیاد ہوتی تھی۔

بچے کی عمر دو برس سے تجاوز کر جاتی تو اس کو کھانا کھلانے، اٹھنے بیٹھنے، سونے اور آرام کرنے کی عادات میں تربیت دی جاتی تھی۔ بہت دیر تک چت لیٹنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جاگتے یا سوتے میں دونوں ہاتھ سینہ پر آجانا یا ٹانگ پر ٹانگ دھر لینا بہت منحوس تھا۔ ان اطوار سے بچوں کو بچانے کے لئے ان کو بار بار کروٹیں دلا دی جاتی تھیں۔ یہ عادت ان کے خمیر میں اتنی راسخ ہو جاتی تھی کہ آخر عمر تک کروٹیں ہی لے کر محو خواب ہوتے تھے۔

’نہ روم، نہ آتھنیں، نہ قسطظنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلربا ہوگا جتنا یہ شہر‘

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شان دہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ موم کے جھونکوں سے کھلانے لگیں اور سارا ماحول تعمیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

’دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک‘

اسی کے پیش نظر ’نیادور‘ کے ہر شمارے میں ’گزشتہ لکھنؤ‘ کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطہ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی تیرہویں کڑی کے طور پر مرزا جعفر حسین کی کتاب ’قدیم لکھنؤ کی آخری بہار‘ سے ایک تحریر ’تعلیم و تربیت اطفال‘ حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ ’نیادور‘ ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

روسا کے بچوں کی تربیت حقیقی معنوں میں اسی وقت سے شروع ہو جاتی تھی جب وہ انا کے آغوش میں مٹھیاں باندھنے، ٹائکین اچھالنے اور قلقاریاں مارنے لگتے تھے اور جب وہ کھلائی کی گود میں ہوا خوری کے لئے محل کے باہر لے جائے جاتے تھے۔ اناؤں اور کھلائیوں کو مار مور کرنے کے قبل کئی دن تک اچھی طرح پرکھ لیا جاتا تھا اور یہ معائنہ گھر کی بڑی بوڑھیاں کیا کرتی تھیں۔ سب سے بڑی معلمہ مادر گرامی یعنی بیگم صاحبہ خود ہوتی تھیں۔ جن میں شرافت و انسانیت، مہر و مروت اور پاک بازی و فرض شناسی کے جوہر پیوست ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پرانے لکھنؤ کے روسا و عمائدین کم سے کم تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی کردار و شرافت کے مالک ہوتے تھے۔

دودھ پینے کے زمانے میں ان کو انگوٹھا بالخصوص پیر کا انگوٹھا چوسنے سے حکمت عملی کے ساتھ باز رکھا جاتا تھا۔ انا دودھ پلانے میں اس کا لحاظ رکھتی تھی کہ اتنی شکم پری نہ ہو کہ معدہ غذا اگل دے یا ہضم کرنے میں دیر لگائے۔ فطری جسمانی اخراجات میں پابندی اوقات کی کوشش رہتی تھی اور بچے کے جسم پر غلاظت بھری رہنا قطعاً گوارا نہیں ہوتا تھا۔ کھلائی یا دوا باہر نکلتی تو بچے کو ہر اس نظارے سے بصد ہزار اہتمام محفوظ رکھتی جو اخلاق سوز یا جمالیاتی مذاق کے منافی ہوتا۔ بچے کے رودینے پر انا اور ددانیز چھو چھو سب بے قرار ہو جاتے تھے اور اس کے کمرہ میں بہت زور سے بات کرنا، چیخنا یا کسی کو ڈانٹنا سختی کے ساتھ ممنوع تھا۔

اٹھنے بیٹھنے میں بھی بزرگوں کے عادات و اطوار کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چھوچھو یا دداسہارا دے کر اٹھاتی اور بٹھاتی، انگلی پکڑ کر کھڑا کرتی اور بٹھلاتی تھی، زور سے دوڑنے کا کوئی موقع ہی فراہم نہیں ہونے پاتا تھا۔ چھوچھو کا یہ فرض عین تھا کہ وہ ہر وقت بچے کے ہاتھ پاؤں، سر اور چہرہ صاف و شفاف اور ہمہ وقت اجلے کپڑوں میں ملبوس رکھے۔ چھوچھو کی اس ریاضت سے بچہ خود صفائی اور پاکیزگی کا خوگر ہو جاتا تھا اور جب بھی جسم کے کسی حصے پر میل آجاتا یا کپڑے پر غبار آجاتا تو وہ اپنی جبلی خصلت کے تحت اس طرف انگلی سے اشارے کر کے دوسروں کو متوجہ کر دیتا تھا۔

فی زمانہ دودھ پیتے بچوں میں ایسے خصائل کا موجود ہونا لوگوں کو باور نہ ہوگا لیکن راقم کے خاندان میں دو برس کے کم کی عمر کے شیرخوار بچوں میں ایسی دو مثالیں آج بھی موجود ہیں۔ انہیں دو بچوں میں غذاؤں کے پرانے اطوار بھی ملتے ہیں۔ کھلائی اور چھوچھو تیز سے گود میں لے کر یا بٹھا کر صاف چینی کے خوشنما برتنوں میں کھانا کھلاتی تھی۔ یہ غذا اس عموماً کھیر یا کھچڑی ہوتی تھی۔ فیض تربیت سے یہ نو نہال ایک نوالہ بھی فطری ضرورت سے زیادہ منہ میں رکھنا قبول نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح کھچڑی کی پلیٹ میں اگر اتفاقاً کوئی لوگ، جس سے کھچڑی بگھاری جاتی تھی، نظر آجاتی تو بچہ کھانا کھانے سے فی الفور انکار کر دیتا تھا۔ پھول دار اصلی چینی کی پلیٹوں میں روسا کے کھانا کھانے کا عام رواج تھا۔

فلاکت منڈلانے کے بعد بھی ایرانی مٹی کے بنے ہوئے مصنوعی ظروف استعمال ہوتے تھے۔ ان میں بھی رنگینی، چمک دمک، رنگ روغن، نفاست و لطافت اور جاہیت اصلی چینی سے مشابہ ہوتی تھی۔ بچہ کو زیادہ سے زیادہ رنگین، پھول دار اور خوش نمالیٹ میں کھانا کھلایا جاتا تھا۔ سادہ اور سفید برتن میں کھانا دینا انتہائی بدتہذیبی تھی۔ اس تمام تربیت میں اتنا، کھلائی، ددا

اور چھوچھو کا حصہ تھا اور بیگم کی نگرانی بھی شامل حال رہتی تھی۔ وہ ہر مناسب موقع اور محل پر باہر تشریف لاکے وقتاً فوقتاً معائنہ فرمایا کرتی تھیں اور ضرورت ہوتی تو ہدایات جاری کرتی تھیں جن کی تعمیل ہر ملازمہ بدل و جان کرتی تھی۔

بعض خاندان میں تیسرے برس اور کہیں پانچویں برس بچوں کی خواہ لڑکا ہو یا لڑکی رسم بسم اللہ ادا ہوتی تھی۔ اعزاء و اقارب، دوستوں اور ملازموں کے مجمع میں کوئی عالم دین بسم اللہ پڑھا کے قرآن مجید کے سورہ اقرآب اسم کی پہلی آیت بچے کی زبان پر وارد کرتا تھا۔ اس کے بعد لڑکی کو گھر کی استانی اور لڑکے کو باہر کے معلم کو تعلیم کی خاطر سپرد کر دیا جاتا تھا لیکن لکھنؤ کے پرانے کلچر کی اصلی بنیاد تہذیب و شائستگی، شرافت و انسانیت، روادادی و پاسداری، حسن سلوک اور مراعات اور ریسوس کے تزک و احتشام پر قائم تھی۔ ان بنیادی محاسن کردار و اطوار میں تعلیم سے زیادہ تربیت ضروری تھی اور یہ تربیت سن شعور آجانے تک بچے کی مخصوص ملازموں اور اس سے کہیں زیادہ والدین کے ذمہ رہا کرتی تھی۔ محل کے اندر والدہ محترمہ ہر معاملہ میں پاکیزگی اور محترم درس دیتی تھیں اور بیرونی نشست گاہ میں یہ فریضہ پدر عالی مقدار ادا کرتے تھے۔ بسم اللہ ہو جانے کے بعد کھلائی کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ لڑکے کو نواب کے حضور کسی نہ کسی وقت ضرور لے جا کر بٹھا دے۔ اس شرف حضوری کے حاصل کرنے میں طوائف کی موجودگی، رقص و سرود کی بزم یا بے تکلف دوستوں کی بے تکلفانہ گفتگو کوئی امر خارج نہیں ہوتا تھا۔ نئی روشنی کا چراغ جلنے کے بعد اگر کوئی حاضر الوقت نواب کے لڑکے کو ایسی صحبتوں میں بٹھائے رکھنے پر اعتراض کرتا تو فی الفور جواب ملتا کہ اپنی اولاد کو ہر شعبہ حیات میں سبق دینے اور اس کو زندگی کی ہر شاہراہ میں صحیح راستہ پر چلانا سکھانے کا فریضہ پروردگار عالم نے مجھ پر عائد کیا ہے۔ اس طرز عمل کا یہ نتیجہ تھا کہ

لڑکے اپنی اپنی جبلی صلاحیتوں کے تحت زندہ رہنے اور اچھی زندگی گزارنے کا سبق لینے یا خود اپنی فطری کمزوریوں میں گرفتار ہو کر خراب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایسی مثالیں کثرت سے ملتی تھیں کہ طوائف باز ریسوس کے بچے بڑے ہو کر ثقہ اور معصوم صفت بن جاتے تھے۔ بعض ایسے بھی نکلتے تھے جو تنعم اور عیش پرستی میں اپنے بزرگوں کا چھوڑا ہوا کثیر سرمایہ قلیل قلیل ترمذت میں تباہ و برباد کر دیتے تھے۔

راقم اس خیال کا حامل ہے کہ یہ بد کرداری بزرگوں کے آزادانہ رکھ رکھاؤ کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی تھی بلکہ ان کی تباہی میں اس زمانہ کے عام ماحول کا اثر شامل تھا۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لڑکے مردانگی نشست گاہ میں بیٹھ کر تعیش و تنعم کے مظاہروں سے کبھی کوئی خراب اثر قبول ہی نہیں کرتے رہے ہوں گے لیکن ان کی اپنے پدر عالی مقدار کی بارگاہ میں موجودگی بمقابلہ خراب اثرات کے اچھے عادات و اطوار سیکھنے میں زیادہ مدد و معاون ہوتی تھی۔

خوش کرداری اور خوش اطواری کی تربیت والدین کس طرح دیتے تھے، یہ تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں راقم وہی واقعات پیش کرنا چاہتا ہے جو عہد طفولیت میں خود اس پر گزرے تھے اور جنہوں نے پتھر کی لکیر کی طرح حافظہ پر اثر ڈالا تھا۔ والدہ مرحومہ کا طرز تربیت یہ تھا کہ وہ پاس بٹھا کر کچھ سوالات کرتی تھیں جن کے جوابات سے وہ کوئی نہ کوئی موضوع ٹول کر نکل لیتی تھیں۔ پھر اسی موضوع پر ایک طویل گفتگو فرماتیں یعنی ایک لکچر دیتی تھیں۔ ان کا طرز دل پذیر ہوتا تھا جس میں شفقت مادری بھی شامل ہوتی تھی۔ اس لئے ان کی لمبی سے لمبی تقریر میں بھی دل نہیں گھبراتا تھا۔ دوران تقریر وہ متعدد احادیث اور آیات قرآنی پڑھ کر سناتی تھیں۔ پھر ان کا ترجمہ کر کے مطلب سمجھاتی تھیں۔ مختصر یہ کہ موضوع سخن سے جن باتوں کو دور کا بھی لگاؤ ہوتا وہ سب ان

استوار ہے۔ اس رشتہ کے علاوہ بالکل علیحدہ نوعیت پر ایک دوسرا رشتہ جو انسانیت میں خلل انداز نہیں ہوتا مختلف مذاہب نے خدا اور بندوں کے درمیان قائم کیا ہے۔ مذہب نے زندگی کے علیحدہ علیحدہ طرز ضرور قائم کئے ہیں جن کی پابندی کرتے ہوئے تم ان کے یہاں اور وہ تمہارے یہاں کچھ نہ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں لیکن مذہب کی کوئی طرز انسانی برادری میں حد فاصل قائم نہیں کرتی۔ وہ اپنے دھرم پر ہیں اور تم اپنے مذہب کے پابند ہو لیکن اس کے باوجود وہ بچا ہیں اور تم بھتیجے اور کوئی مذہبی تفریق تم کو ان سے یا ان کو تم سے جدا نہیں کر سکتی۔ یہ عزیز دارانہ تعلق اتنا ہی فطری ہے جتنا مذہب کی تعلیم پر عمل کرنا برحق ہے۔

والدہ محترمہ نے اپنے ان اقوال کی تائید میں متعدد آیات و احادیث کو استدلال میں پیش کیا تھا اور اپنا نکتہ خیال میرے ذہن میں اتنا راسخ کر دیا تھا کہ وہی درس میری سیاسی زندگی میں میرے لئے مشعل راہ بنا رہا۔

□□□

تشریف لے آئیں۔ دور سے وہ میری اشارہ بازیاں ملاحظہ کر چکی تھیں۔ کچھ وقفہ توقف فرما کے اور ادھر ادھر دیکھ بھال کر کے انہوں نے میرے خیالات کا جائزہ لیا۔ میری تربیت کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ میں ان سے بلا تکلف ہر بات صحیح صحیح کہہ دیتا تھا اور طبیعت میں کوئی جھک نہیں پیدا ہوتی تھی۔ اس موقع پر بھی میں نے سارا واقعہ ان کو سنا دیا اور یہ سوال کیا کہ کیا ہماری ناک پاک ہے؟ وہ مسکرائیں اور میں نے ان کے پوچھے بغیر اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ چچا ہمارے گھر کا پانی نہیں پیتے، پان نہیں کھاتے، ہمارے گھر کی ہر چیز کو نجس سمجھتے ہیں لیکن ہماری ناک کو انہوں نے نجس نہیں سمجھا، اپنا ہاتھ اور اپنا رومال خراب کیا اور اس رومال کو پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

محترمہ کے طویل جواب کا ملخص یہ تھا: 'تم بھی تو ان کے یہاں کی کوئی چیز نہ کھاتے اور نہ پیتے ہو تو کیا اس پر ہیز کی وجہ سے وہ تمہارے چچا نہیں رہے۔ باوجود اس طرز عمل کے وہ تمہارے چچا ہیں اور تم ان کے بھتیجے ہو۔ یہ رشتہ انسانیت کی بنیاد پر

کے بیان میں آجاتی تھیں۔ ان کے اس طرز عمل کا یہ فیض تھا کہ میں نے اپنی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق پہلا کارآمد درس انہیں سے سیکھ لیا تھا۔ اس مقام پر صرف ایک مثالی پیش کی جاتی ہے۔ والد مرحوم کے ایک دوست پنڈت انت رام کٹر مذہبی انسان تھے لیکن خلوص و محبت کا مجسمہ تھے۔ والد مرحوم بھی بہت مذہبی تھے اور غیر مسلمین کے ہاتھ کی کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح پنڈت انت رام ہمارے گھر کا نہ پان کھاتے اور نہ پانی پیتے تھے لیکن ہمارے درمیان اتنی قربت تھی کہ میں ان کو چچا کہتا اور وہ میرے اوپر حقیقی چچا کی طرح شفیق تھے۔ جاڑے کا موسم تھا۔ میرا سن چھ یا سات برس کا تھا اور میں نزلہ میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے ناک سے کچھ ریزش ہوئی۔ پنڈت جی نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور میری ناک صاف کر کے اس کو پھر جیب میں رکھ لیا۔ ان کی یہ حرکت میرے دل و دماغ کو باوجود صغیر سنی کے متاثر کر گئی۔ نوالہ منہ میں تھا اور میں ہاتھوں نیز چشم و ابرو سے کچھ اشارے کر رہا تھا۔ دفعتاً والدہ محترمہ

قصیدہ خالص عربی صنف ہونے کے باوجود فارسی ادب میں زبردست مقبول ہوئی۔ فارسی میں رودکی، منوچہری، ناصر خسرو، خاقانی، انوری، شیخ سعدی اور عربی شیرازی جیسے شعراء نے قصیدے کی مقبولیت کو دوبالا کر دیا۔ اردو ادب نے فارسی سے ہی قصیدہ کو مستعار لیا۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی نے اردو قصیدہ کی داغ بیل ڈالی۔ شمالی ہند میں سودا، مصحفی، انشا، مومن، ذوق، غالب اور اس کے بعد منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی اور جلال لکھنوی جیسے شعراء نے قصیدہ گوئی میں اپنا نام پیدا کیا۔ دور حاضر میں گمان غالب ہے کہ یہ صنف بحرانی دور سے گزر رہی ہے حالانکہ کولکاتا، حیدرآباد، امر وہہ، الہ آباد، فیض آباد لکھنؤ اور بہار کے کچھ شہروں میں چند شعراء قصیدہ کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اردو علم و ادب کے حلقوں میں قصیدہ کے تیس نئے نسل کا رجحان کمیاب ہے۔ ادارہ 'نیادور' بہت جلد قصیدہ کے فن، روایت اور تاریخ پر ایک شمارہ شائع کرے گا۔ قلمی تعاون درکار ہے۔ (ایڈیٹر)



کیٹو وشونا تھر ریڈی

رنگسائی پورم، پیرنگل، آندھرا پردیش

پنج خانہ

ہرے بھرے نیم کے درخت کے سامنے پرانے زمانے کا پنج خانہ تھا۔ دیواروں پر جا بھ جا پیڑی اکھڑ گئی تھی۔ بیروں کے جشن کے وقت لیے پوتے گئے چونے کی سفیدی میلی پڑ گئی تھی۔ چھت پر لگے شہتیروں میں دیمک لگ گئے تھے۔ وہ کھوکھلے ہوتے جا رہے تھے۔ شہتیروں پر دوڑ لگاتے چوہوں کی وجہ سے لونی مٹی رہ رہ کر گر رہی تھی۔ شہتیر آج یا کل گرنے ہی والے تھے۔ ان شہتیروں میں دو مضبوط شہتیروں سے بیروں کا صندوق لٹک رہا تھا۔ اس صندوق میں چھوٹے بڑے پنچے اگلے محرم کی آمد کا انتظار کر رہے تھے جو صرف محرم کے دنوں میں ہی چمک دمک کے ساتھ لہکتے انگاروں پر چلے تھے، جلوس میں شان کے ساتھ نکلے تھے۔

ٹھیک اس صندوق کے نیچے تھوڑا بھٹ کر، ایک ڈھیلی پڑی جھولے جیسی لٹکتی ہوئی چار پائی پڑی ہوئی تھی جس پر مستان اکیلا بیٹھا ہوا بانی میں لڑنے کے لئے تیار مرغے کو دانہ کھلا رہا تھا۔

اس مرغے کی ٹانگوں اور پروں کو اپنی رانوں کے نیچے دبا کر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اس کی چونچ کو کھول کر پکڑے ہوئے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں ہری جوندھری (جوار) اور مونگوں کو لے کر دھیرے دھیرے بڑی احتیاط سے کھلا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی دھیان رکھا تھا کہ کہیں وہ دانے چھٹک کر نیچے نہ گر جائیں۔ اس سٹی کی پانگ کے سوراخوں میں جسے کو لٹے کو انکا کر اس میں پانی بھر رکھا تھا۔ رہ رہ کر مرغے کے منہ میں دو تین گھونٹ پانی ڈالتا جاتا تھا۔

مرغے نے پانی پی کر گردن کو تھوڑا پھلایا۔ مرغے کے گردن کو سہلاتے ہوئے ایک بار پنج خانہ کو چاروں طرف دیکھا پھر اپنے آپ بولنے لگا۔ ”میرے یار! اب کی دنگل میں مرغے بازی میں اپنے مد مقابل مرغوں کو شکست دے کر اس کی اکڑ کو مٹا دینا ہوگا۔ ایسی چالیں چلانا کی بازی جیت لیں! اگر بازی جیت جاؤ گے تو تمہیں نیا جھمکا بنا کر پہناؤں گا۔ اگر سب کچھ ٹھیک

تیلگو زبان کے معروف ادیب اور افسانہ نویس اور مترجم کیٹو وشونا تھر ریڈی کے ۳۶ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔

ان کی کہانیوں کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ متعدد ادبی اعزازات سے بھی نوازے جا چکے ہیں۔

پیش ہے ان کی کہانی ”پنج خانہ“ جس کا اردو ترجمہ ”فاضل احسن ہاشمی“ نے کیا ہے۔

رہا تو پنج خانے کی کم سے کم اس سال مرمت کرواؤں گا۔ بڑی بازی جیت جاؤ گے تو نیا پیر بناؤں گا۔ خوب کھاؤ رہے... میرے یار...“

مستان نے مرغے کی چونچ کو پھر کھول کر پاس ہی رکھے سوپ سے مٹھی بھر دانے کو لے کر بھر دیا۔ اس نے پنج خانے کے سامنے موجود نیم کے پیڑ کی نیچے کھڑے سرخ اشوتھیر ریڈی اور اس کے ساتھ آئے چار پانچ لوگوں کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

”چناؤ کے دنوں میں ہر ایرے غیرے نتھوں

خیرے کے پاس پھر لگانا پڑتا ہے۔“ کہہ کر دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے اشوتھیر ریڈی نے بناوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے بہت ہی عزت کے ساتھ مستان سے پہلے کی ڈھیلی جھولتی سے چار پائی پر پھٹی پرانی بنیان اور لنگی پہنے بیٹھا ہوا مستان پیر کی طرح اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا۔ یکا یک ہاتھ کی پکڑ سے چھوٹ کر پر پھڑ پھڑاتا ہوا مرغانے والے کالے سوپ پر اچھل کر، پنجوں کے صندوق پر جا بیٹھا اور بانگ دینے لگا۔

آٹھ آنہ (یعنی ۵۰ پیسے کا سکہ) کے دانوں کا زمین پر گرنے کی وجہ سے مستان کو مرغے پر غصہ آ رہا تھا۔ ”بازی لڑنے والے مرغوں کو مستان کے سوا اور کوئی نہیں پال سکتا ہے۔“ اشوتھیر ریڈی کی تعریف سن کر مستان کا غصہ غائب ہو گیا۔ وہ دوڑتے ہوئے اپنی مٹی کی جھونپڑی میں گیا اور ایک چادر نما گدڑی لا کر اسے ڈھیلی چار پائی پر بچھا دیا۔ مستان نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”تشریف رکھے!“

وہاں آئے کسی نے بھی اس چار پائی پر بیٹھنے کی ہمت نہیں کی۔ ”اتنے لوگوں کو چار پائی پر بٹھاؤ گے تو کام کیسے چلے گا؟“ ان میں سے کسی نے طعنہ مارا۔

ان میں سے ایک نے اس کی تعریف میں پل باندھتے ہوئے کہا۔ ”جو بھی ہومسلمانوں کی طرح خاطر داری کرنا ہم کا پوزاٹ والوں کو نہیں آتا ہے۔“

”اس کے ابا جان بوڈیں صاب کے زمانے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ان کی خاطر داری سے ہمیں کی سیٹھی دانتوں تلے لنگی دبا لیا کرتے تھے۔



انتون چیخوف

۱۸۶۰ ۱۹۰۴

اذیت

جلدی چل شیطان گھوڑی! تجھے ہیضہ ہو جلدی چل!
مستری نے گھوڑی کو چابک لگایا اور بیوی کی طرف دیکھے بغیر بڑا تاتا گیا۔

’جناب! خدا گواہ ہے۔۔۔ میں پاک سلیب کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میں علی الصبح ہی گھر سے روانا ہو گیا تھا، میں یہاں وقت سے کیسے پہنچ پاتا، ماں مریم نے بہت غصے میں یہ بر فیلہ طوفان برپا کر دیا۔ مہربانی کر کے آپ خود دیکھ لیں، کوئی عمدہ قسم کا گھوڑا بھی یہاں وقت پر نہیں پہنچ سکتا تھا جبکہ میری گھوڑی آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ گھوڑے کے نام پر داغ ہے، اور پاول ایوانچ تیوریاں پڑھا کر چلا گیا، میں تم لوگوں کو جانتا ہوں، تم لوگ ہمیشہ کوئی نا کوئی بہانہ تلاش کا رہی لوگ! خاص طور پر تم گریٹکا، تمہیں تو میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں، میرے خیال سے تم راستے میں آدھا درجن شراب خانوں پر رکے ہو گے! اور میں کہوں گا، ’جناب کیا میں کوئی سنگ دل یا کافر ہوں؟ میری بیوی مجھے چھوڑ کر خدا کے پاس جانے کی تیاری

میں ہے، وہ مر رہی ہے اور میں شراب خانوں کے پیچھے بھاگوں گا، یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں، جہنم میں جائیں شراب خانے! تب پاول ایوانچ تمہیں اسپتال کے اندر لانے کی اجازت دیں گے اور میں ان کے پیروں میں گر جاؤں گا، پاول ایوانچ، حضور ہم تمہارے دل سے آپ کا شکر یہ ادا کرتے ہیں! ہماری بیوقوفیوں اور غلطیوں کو معاف کریں، ہم کسانوں کی طرف اتنا

تمہارے جسم پر سپرٹ کی مالش کروا دیں، سپرٹ تمہارے جسم کا درد کھینچ لے گی، پاول ایوانچ اپنی بھر پور کوشش کریں گے، وہ چلائیں گے، پیر چلائیں گے لیکن وہ تمہارے لیے اپنی پوری کوشش کریں گے۔ وہ بہت نیک اور لمنسا آدمی ہیں، خدا انہیں لمبی عمر عطا کرے! دیکھنا ہم لوگ جیسے ہی وہاں پہنچیں گے وہ

انتون چیخوف افسانہ نگاری کی تاریخ کی ایک عظیم شخصیت تصور کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے بے شمار کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔ ان کی تحریریں انسانی مزاج کی غماز ہیں۔ ان کی کہانیاں اور ڈرامے روسی انقلاب سے قبل کے سماج کا بہترین عکس پیش کرتی ہیں۔ ان کے کردار ترقی پسندی کی مثالیں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں چیخوف کی کہانیوں کے ترجمے بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ پیش ہے انتون چیخوف کی کہانی ’اذیت‘ جس کا اردو ترجمہ ’گل جبین اختر‘ نے کیا ہے۔

بھاگ کر اپنے کمرے سے باہر آجائیں گے اور مجھ پر برسنا شروع کر دیں گے، کیسے؟ کیوں؟ وہ چیخیں گے تم وقت پر کیوں نہیں آئے؟ میں کوئی کتا نہیں ہوں جو تم شیطانوں کے اشاروں پر ناچتا رہوں، تم صبح کیوں نہیں آئے؟ بھاگ جاؤ! دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ اب کل آنا! اور میں کہوں گا ڈاکٹر صاحب! پاول ایوانچ! ماں باپ۔۔۔!

مستری گرگوری بیٹرو، جسے پچھلے کئی سالوں سے گال چینسکوئی ضلع کے لوگ ایک ماہر دستکار کے ساتھ ساتھ ایک کابل کسان کے طور پر جانتے تھے، اپنی بوڑھی بیوی کو اسپتال لے جا رہا تھا، اسے گاڑی ہانک کر تقریباً ۲۰ میل کا سفر طے کرنا تھا اور سڑک بہت زیادہ خراب تھی، جس پر گاڑی ہانکنا گرگوری جیسے کابل تو کیا سرکاری ڈاکے تک کے بس کے باہر کی بات تھی۔ جمادینے والی ٹھنڈی ہوا سیدھے اسکے چہرے پر لگ رہی تھی، برف کے گالے ہوا میں چاروں طرف گول گول اڑ رہے تھے۔ بتانا مشکل تھا کہ برف آسمان سے گر رہی ہے یا زمین سے۔ برف کے دھویر کی وجہ سے کھیت، تار کے کھبے اور جنگل کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے اور جب تیر ہوا کا تھپیرا گرگوری کو لگتا تو اسے گھوڑے کا جوا بھی نظر نہ آتا۔ بوڑھی، ناتواں، گھوڑی رینگ رینگ کر چل رہی تھی۔ برف کے ڈھیر سے ایک ایک قدم نکالنے اور گردن جھٹکنے سے کھینچنے میں ہی اسے ساری طاقت لگانی پڑتی تھی۔ مستری کو جلدی تھی۔۔۔ وہ بے چینی سے بار بار اپنی سیٹ سے کود کر اٹھتا۔ بیٹھتا اور گھوڑی کی پیٹھ پر چابک مارتا۔

’رومت میترونا، وہ بڑ بڑیا۔
تھوڑا صبر رکھو، خدا کرے ہم جلدی سے اسپتال پہنچ جائیں اور پل بھر میں سب ٹھیک ہو جائیگا۔ پاول ایوانچ تمہیں کچھ دوا دیں گے یا تمہاری فصد کھول کر خون نکالنے کو کہیں گے یا ہو سکتا ہے بھلائی میں

سنگدل نہ ہوں، آپ ہمیں لات مار کر نکال دیں، ہم اسی کے حقدار ہیں۔ جبکہ آپ رحم کر کے ہم سے ملنے باہر برف میں نکل آئے ہیں! پاول ایوانچ مجھے ایسے دیکھیں گے جیسے اب وہ مجھے ماریں گے اور کہیں گے، 'زیادہ اچھا ہو شراب پینا بند کر بیوقوف اور میرے پیروں میں گرنے کے بجائے اپنی بیوی پر رحم کر۔ تمہارے تو کوڑے لگنے چاہئے!' آپ سہی کہہ رہے ہیں، کوڑے پاول ایوانچ! خدا جانتا ہے، لیکن ہم آپ کے پیروں میں کیسے نہ گریں جبکہ آپ ہمارے خیر خواہ ہیں اور ہمارے اصلی باپ! حضور میں خدا کے سامنے قسم کھاتا ہوں، آپ میرے منہ پر تھوک دینا اگر میں اپنی بات سے پھر جاؤں، جیسے ہی میری میٹر ونا ٹھیک ہو جائیگی، پہلے جیسی صحت مند اور اچھی حالت میں، آپ جو حکم دینے کی مہربانی کریں گے میں حضور کے لیے بنا کر دوں گا! سگریٹ کیس، اگر آپکو پسند ہو تو، صنوبر کی عمدہ لکڑی کا سگریٹ کیس۔۔۔۔۔ کراک ویٹ کھیلنے کے لیے گیند۔۔۔ لکڑی کی بوتلیں غیر ملکی قسم کی۔۔۔ میں آپ کے لیے کچھ بھی بناؤں گا اور اسکے لیے میں آپ سے بیٹی کا چوتھائی بھی نہ لوں گا، ماسکو میں ایسے سگریٹ کیس کے لئے لوگ آپسے چار روبل اٹینٹھے، لیکن میں آپ سے ایک کوپک بھی نہیں لوں گا! ڈاکٹر ہنس کر کہے گا، 'اچھا ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔۔۔' بس کر بہت ہوا، لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ تم شرابی ہو۔۔۔ ان بھلے لوگوں سے بات کرنا مجھے آتا ہے بوڑھی عورت، ایسا کوئی بھلا مانس نہیں ہے جسے میں اپنی باتوں سے منانا لوں، بس خدا ہم پر اتنا رحم کرے کہ ہم راستہ نہ بھولیں۔ آہ، کیسا طوفان ہے، برف کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔۔۔

مستری برابر بڑبڑاتا جاتا۔ اپنی بے قراری چھپانے کے لئے وہ لگا کر رارڈ کی طرح بلبل کرتا جاتا۔ اسکی زبان پر الفاظ کی کمی نہیں تھی مگر ذہن میں اٹھنے والے خیالات اور سوالات کا کوئی خاتمہ نہیں تھا،

اذیت نے ناگہاں اسے گھیر لیا، اچانک اور غیر متوقع طور پر وہ غموں میں ڈوب گیا تھا اور اب وہ خود کو اس دکھ سے باہر نہیں نکال پا رہا تھا۔ اسکے اوسان خطا ہو گئے تھے، ابھی تک اسنے لا پرواہی کی زندگی گزاری تھی مانوں شراب کی خماری میں، خوشی اور غم کا اسے کچھ اندازہ ہی نہیں تھا اور اب اچانک اسے سینے میں ایک ناقابل برداشت درد محسوس ہونے لگا تھا۔ لا پرواہ، کابل، شرابی دفعتاً اپنے آپ کو کام میں مصروف اور فکر و جلد بازی میں خود کو قدرت سے جو بھٹتا ہوا پارہا تھا۔

مستری نے یاد کیا کہ یہ مسئلہ پچھلی شام کو شروع ہوا تھا جب وہ ہمیشہ کی طرح پی کر شام کو گھر لوٹا اور اپنی برسوں پرانی عادت کے مطابق گالی کبنے اور گھونسنے چلانے لگا، اسکی بوڑھی عورت نے اپنے ظالم شوہر کو ایسی نگاہ سے دیکھا جیسے اسنے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، عام طور پر اسکی بوڑھی آنکھوں میں قربانی، ڈر پوک بالکل ایسے کتے کی طرح جو برابر پیٹا جاتا ہوا اور بہت کم خانے کو ملتا ہو۔ مگر اس وقت وہ اسکی آنکھیں ساکن اور ساکت تھیں جیسے سنتوں کی مجسموں کی آنکھیں ہوتی ہیں یا بستر مرگ پر پڑے انسان کی۔ ان تکلیف زدہ آنکھوں نے مستری کے دل میں اذیت کا بیج بویا تھا، جو اس باختمہ مستری پڑوسی سے گھوڑی مانگ کر لایا تھا اور اس امید کے ساتھ اسپتال لے جا رہا تھا کہ پاول ایوانچ اپنے چورن اور ملہم کی مدد سے بوڑھیا کی آنکھوں میں پہلے والی جھلک لادے گا۔

سنو میٹر ونا! وہ بولا۔ اگر پاول ایوانچ تم سے پوچھیں کیا میں تمہیں پیٹتا ہوں، تم کہنا نہیں صاحب اور میں تم پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، میں قسم کھا کر کہتا ہوں اور کیا میں نے کبھی کسی عداوت میں تجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے؟ میں تو بس بنا سوچے بنا کسی وجہ کے ہاتھ اٹھا تا تھا۔ مجھے تو تجھ پر رحم آتا تھا، اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو پریشان ہوتا مگر میں تو تجھے اسپتال لے جا رہا ہوں۔۔۔ اور اپنی

ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں اس طوفان میں جہاں ہر طرف برف ہے۔ خدا تیرا شکر ہے! بس ہمیں راستہ نہ بھولنے دینا۔ میٹر ونا اب تمہارے بغل کا درد کیسا ہے، تم کچھ بولتی کیوں نہیں میٹر ونا؟ میں نے پوچھا تمہاری بغل کا درد کیسا ہے؟

اسے تعجب ہو رہا تھا کہ کہ بوڑھیا کے چہرے کی برف پگھل نہیں رہی تھی، عجیب بات یہ تھی کہ اسکا چہرہ بھی لمبو تر اور کھنچا ہوا لگ رہا تھا، اور ایسے پھیکا بھورے رنگ کا ہو رہا تھا مانو گندی موم، سنجیدہ اور سخت لگ رہا تھا۔

'اے پگل بوڑھیا! اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، میں خدا کو حاضر ناظر نظر جان کر تجھے ایمانداری سے بتا رہا ہوں اور تو۔۔۔ پوری بیوقوف ہے، جا میں تجھے پاول ایوانچ کے پاس نہیں لے جاؤں گا۔'

مستری نے لگام چڑھانی اور سوچنے میں لگ گیا، بوڑھیا کی طرف دیکھنے کی اسکی ہمت نہیں ہو رہی تھی، وہ ڈرا ہوا تھا اور بغیر جواب ملے سوال کرتے جانے سے بھی وہ ڈر رہا تھا، آخر کار اپنی پیش پیش دور کرنے کی غرض سے اس نے بوڑھیا کی طرف دیکھے بغیر اسکا ٹھنڈا ہاتھ محسوس کیا اور گہری مایوسی سے ہاتھ چھوٹ گیا!

ہائے مرگئی، یہ کیا ہو گیا!

اور مستری رونے لگا۔ اسے افسوس سے زیادہ جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی، وہ سوچنے لگا کہ دنیا میں سب کچھ کتنی جلدی گزرتا ہے، اسکی یہ پشیمانی ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ سب کچھ ختم ہو گیا، مرنے سے پہلے اسے اپنی بیوی کے ساتھ رہنے، اپنا ملال دکھانے کا بھی وقت نہیں مل پایا۔ وہ اسکے ساتھ ۴۰ سال رہا، مگر وہ ۴۰ سال ایک غبار کی طرح گزر گئے۔ شراب پینے، لڑنے جھگڑنے اور غربی میں کہ زندگی کا احساس ہی نہیں رہا۔ بوڑھیا ٹھیک اس وقت گزر گئی جب اسے احساس ہوا کہ اسکے لئے اسکے دل میں ملال ہے کہ وہ

اسکے بنا نہی رہ سکتا اور اسنے اسکے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا۔

وہ گاؤں کے چکر لگانے جاتی تھی" اسے یاد آیا، میں خود اسے روٹی کے لئے بھیک مانگنے بھیجا کرتا تھا.. آہ یہ کیا ہو گیا! وہ ابھی ۱۰ سال تک اور زندہ رہ سکتی تھی، بیچاری! وہ سوچتی ہوگی کہ میں سچ میں ایسا آدمی تھا، پاک ماں! لیکن میں کہاں جا رہا ہوں؟ اب اسے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، بلکہ قبر کی ضرورت ہے.. اب مڑ جاؤ،"

گر بیگوری نے لگام کھینچ کر گھوڑی کا منہ پیچھے گھمایا اور اپنی پوری طاقت سے اسے چابک جمائی۔ سڑک ہر گھنٹے بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ اب اسے گھوڑی کا جو اتنا تک نظر نہیں آ رہا تھا، گاڑی کبھی کبھی صنوبر کے درختوں کو چکیتی ہوئی نکل جاتی تھی، کوئی کالی چیز، مستری کا ہاتھ رگڑتی اسکی آنکھیں چندھیا جاتی اور پھیڑے مار کر نکل جاتی، نظروں کے سامنے سفیدی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسے یاد آیا کہ آج سے ۴۰ سال پہلے میرونا جوان، خوبصورت اور خوش دل تھی۔ وہ ایک اچھے خاندان سے آئی تھی، اسکی شادی گر بوگوری سے اسکی دستکاری میں مہارت کی وجہ سے کی گئی تھی، خوشحال زندگی کی تمام آسائشیں موجود تھیں، مگر شادی کے فوراً بعد ہی شراب کے نشے میں وہ چولہے کی لگار پر ٹانگیں پھیلا کر سو گیا تھا اور اب تک وہ پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا۔

اسے شادی یا تھی مگر شادی کے بعد کیا ہوا اسے کچھ یاد نہیں تھا، سوائے شراب پینے، چولہے کی لگار پر لیٹنے اور جھکڑا کرنے کے۔ عمر کے ۴۰ سال اسی طرح تباہ ہو گئے تھے۔

سفید برف کے بادل دھیرے دھیرے بھورے ہو رہے تھے۔ شام ہو چلی تھی۔

میں کہاں جا رہا ہوں؟" دفعتاً مستری نے خود

سے پوچھا، مجھے اسکی تدفین کے بارے میں سوچنا چاہئے اور میں اسپتال جا رہا ہوں، مانو میں پاگل گیا ہوں"

گر بیگوری پھر پیچھے گھوما اور گھوڑی کو چابک لگایا۔

چھوٹی گھوڑی نے پوری طاقت لگائی اور پھنکار کر دکلی چال چلنے لگی۔ مستری اسے برابر چابک مارتا جاتا۔ اسے اپنے پیچھے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پیچھے مڑے بغیر اس نے اندازہ لگایا کہ لاش کا سر گاڑی سے نکل رہا ہے۔ رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی، ہوا اور بھی ٹھنڈی اور ٹھنڈی بھری ہوئی گئی۔

"کاش زندگی دوبارہ شروع کرنے کو مل پاتی" مستری سوچنے لگا، "میں نئی خراخرا دیوں، اس سے سامان بناؤں، نئے آرڈر ملیں اور سارا پیسہ اپنی بوڑھیا کو دوں"

اور اسکے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی، وہ اسے تلاش کرنے لگا، اسے پڑنے کی کوشش کی مگر اسکے ہاتھ کام نہیں کر رہے تھے۔

کوئی بات نہیں، اسنے سوچا، گھوڑی اپنے آپ چلے گی، وہ راستہ جانتی ہے، میں جب تک ایک چھپکی لے پاتا۔ جنازے اور دعا سے پہلے تھوڑا وقت آرام کر لیتا۔"

مستری نے آنکھیں بند کی اور اونگھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے لگا کہ گھوڑی رک گئی ہے، اس نے آنکھیں کھولی اور اپنے سامنے گہرے رنگ کی جھوپڑی یا بھوسے کے جیسا ڈھیر دیکھا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے سلیج سے اتر کر پتا کرنا چاہئے تھا کہ وہ کہاں ہے مگر تھکان اور سستی نے اسے اس قدر گھیر لیا تھا کہ ٹھنڈی میں جم جانا منظور تھا مگر وہاں سے ہلنا نہیں اور وہ سکون کی نیند سو گیا۔

جب وہ جاگا تو وہ ایک بڑے سے کمرے میں

تھا جہاں کی دیواریں پتی ہوئی تھیں، کھڑکی سے چمکدار دھوپ اندر آرہی تھی۔ مستری نے دیکھا کہ وہاں لوگ موجود ہیں۔ اور پہلی بات جو اسکے ذہن میں آئی وہ یہ کہ اسے ایک سمجھدار اور عقلمند انسان لگنا چاہئے جسے سب کچھ پتا ہو۔

پادری کو بتانا چاہئے میری عورت کے لینے دعا کرنی ہے، اسنے کہا، ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے، تم لیٹے رہو، ایک آواز نے اسے ٹوکا،

پادریل ایوانچ، ڈاکٹر کو اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے مستری کی چیخ نکل گئی، حضور، ہمارے خیر خواہ وہ اچھل کر ڈاکٹر کے پاؤں میں گر جانا چاہتا تھا مگر اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں کام نہیں کر رہے ہیں۔

حضور میرے ہاتھ کہاں ہیں اور میرے پاؤں کو کیا ہوا؟"

اپنے ہاتھ پاؤں کو الوداع کہہ دو۔ وہ جم چکے تھے، اب بس کرو اور تم روکس لینے رہے ہو؟ خدا کا شکر ادا کرو کہ تم اپنی زندگی جی چکے ہو، میرے حساب سے تمہاری عمر ۶۰ سال ہوگی، جو تمہارے لینے بہت ہیں۔

میں دکھی ہو رہا ہوں، مہربانی کر کے مجھے معاف کیجئے اگر مجھے ۵-۶ سال اور مل پاتے...."

کس لئے گھوڑا میرا نہیں ہے، مجھے اسے واپس کرنا ہوگا۔ اپنی بیوی کی تدفین کرنی ہوگی۔ اس دنیا میں سب کچھ کتنی جلدی ختم ہو جاتا ہے! حضور، مائی باپ، پادریل ایوانچ! صنوبر کی لکڑی کا ایک سگریٹ کیس ٹھیک رہیگا! میں آپ کو کروٹ کی بال بنا کر دوں گا" ڈاکٹر ہاتھ ہلا کر وارڈ سے باہر نکل گیا، مستری کا سب ختم ہو چکا تھا۔

□□□



راج موہن جھا

(وفات ۲۰۱۶ء)

ہمدردی

بعد کچن پہلے اس نے خود سنبھالا تھا۔ مڑو آتب چھوٹا تھا۔ گینسی نے آہستہ آہستہ اس سے چھوٹے موٹے کام کروانا شروع کئے۔ وہ گینسی کا پکا اسسٹنٹ بن گیا۔ پھر مختار کل بن کر گینسی کو کچن کی فکر سے مکمل طور پر آزاد کر دیا۔ بیٹے کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اپنے چھوٹے بیٹے پر گینسی کو فخر ہے۔

مگر دوسرے بیٹے کا کیا کرے؟ بڑا بیٹا مچھن ما، نے اس کے خوابوں کو ٹی میں ملا دیا۔ کتنے چاؤ سے نام رکھا تھا من چن، بچپن میں گول مٹول تھا۔ سب اسے گود میں اٹھائے ہوئے پھرتے۔ سب کے دل کو چین دینے والا تھا وہ۔ اس لئے نام رکھا من چن مگر بڑا ہو کر وہ ایسا نکلا کہ اس کا نام لیتے ہوئے گینسی کانپ کانپ جاتا ہے۔ بچپن میں بھکوان جیسا معصوم تھا، بڑا ہو کر راکشس بن گیا۔ ابھی گھر میں نہیں ہے۔ گھر میں رہتا ہی کب ہے؟ اچھا ہی ہے۔ مرنے کا ایک کارن وہ من چن کی دہشت گردی ہی کو مانتا ہے۔ دارو پی کر آتا اور ماں کو نونچ کھسوٹ کر روئے چھین لے جاتا۔ محلے کا سردار بنا پھرتا ہے۔ ماں بے چاری محلے والوں کے طعن سن کر دل جلاتی۔ یہ دکھ ہی اسے کھا گیا۔

بیٹے کا دکھ گینسی کو اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے لیکن وہ کبھی کیا سکتا ہے؟ ایک دن وہ بھی اسی طرح جل جل کر مر جائے گا۔ بیٹا بھی کبھی جی کا جنجال ہوا ہے؟ مگر گینسی نے دیکھا ہے، بھوگا ہے۔ اس لئے یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔

اچانک گینسی سن رہ گیا۔ اخبار کے پہلے صفحہ

خراب دن آئے۔ صرف سات دنوں کے بخار نے ان کی ماں کی جان لے لی۔ محلے کے ڈاکٹر کی ہومیوپیتھک دواؤں سے فائدہ نہیں ہوا تو اسپتال لے جانے کی بابت وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ایک بے چارہ فور تھ گریڈ ملازم اور کبھی کیا کر سکتا ہے؟ پھر وہ تو سرکاری ملازمت میں ہے۔ سرکاری ملازمت کتنوں کو ملتی ہے؟ یہ کوارٹر بھی اسی لئے ملا ہے، ورنہ وہ کہاں رہتا؟ وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کیا ہوتا جب؟

اخبار کے پہلے صفحہ کا آدھا حصہ وہ پڑھ چکا

میتھی زبان کے معروف ادیب راج موہن جھا کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں غلطی نامہ، بھننے ہی و گیا پتی، آئی کالمی پر سو خاصہ شہرت کی حامل ہیں۔ ان کی کہانیاں عام روش سے ہٹ کر قارئین کو متاثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ پیش ہے ان کی مشہور کہانی 'ہمدردی' جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر بانو سرتاج نے کیا ہے۔

تھا۔ اخبار پڑھنے کا اس کا اپنا طریقہ ہے۔ پہلے صفحہ کی وہ ایک ایک سطر پڑھتا ہے۔ چاہے کوئی خبر ہو۔ روزانہ چھپنے والی عصمت درمی کی خبریں، قتل اور ڈاکہ کے سماچار یا بلائکار، دہشت گردی کی خبریں، وہ پڑھتا ہے۔ اب یہ سب اخبار کے مستقل کالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہ روزانہ نہیں چاٹ جاتا ہے۔ مڑو آس کی مدد کرتا ہے۔ کچن کی ساری ذمہ داری اس نے اپنے سر لے رکھی ہے۔ اس کی بیوی کی موت کے

گینسی (Gansi) باہر بیٹھ کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے مڑو آچائے رکھ گیا تھا۔ چائے کے ساتھ اخبار پڑنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ اور کچھ ہونہ ہو، اس مزے کا بندوبست گینسی نے کر لیا ہے۔ ایک قطار میں بنے ان چھوٹی ٹائپ کوارٹرس کے آگے کافی جگہ خالی ہے۔ یہ جگہ چوڑائی میں جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے نالی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے آگے سڑک ہے۔ یہ جگہ کس کی ہے؟ نزول کی یا کپنی کی؟ یہ گینسی نہیں جانتا لیکن اس نے اپنے کوارٹر کے سامنے جہاں صبح کو دھوپ آتی ہے۔ ایک چوکی رکھوادی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جاڑے کی دھوپ میں بیٹھ کر چائے کی چسکی لیتے ہوئے اخبار پڑھنے سے بڑھ کر دنیا کا کوئی سکھ نہیں ہو سکتا۔

دن میں جب مرد ڈیوٹی پر چلے جاتے ہیں، اپنے اپنے کوارٹر کے آگے بیٹھ کر ان کی عمر تیس ایک دوسرے کے بالوں میں جوئیں ڈھونڈتی اور مارتی ہیں۔ ان کے بچے مٹی کے برتن کے ٹکڑوں (کھپٹے) سے لکیر کھینچ کر ایکلے، ڈکھلے کھیلتے ہیں۔ گینسی نے کئی مرتبہ سوچا کہ چوری چکاری کے اس زمانے میں چوکی کو کھلے میں رکھنا مناسب نہیں مگر صبح کی دھوپ اور دھوپ میں بیٹھ کر چائے پینے کا لطف۔۔۔ ان دونوں نے اسے چوکی اندر رکھنے سے باز رکھا۔ مڑو آئے سب کام خوش اسلوبی سے سنبھال لیا ہے۔ ان کی ماں زندہ تھی تو انہیں کبھی رسوئی میں جھانکنے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی۔ دن بھر گلی ڈندا، اکلے ڈکھلے کھیلتے پھرتے۔

کے نچلے حصہ کی اک خبر ہی ایسی تھی۔ ارے باپ! اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ من چن کہیں گھر تو نہیں آگیا۔ اسے موجود نہ دیکھ کر تسکین ہوئی مگر دوسرے ہی لمحہ خیال آیا کبھی نہ کبھی تو وہ گھر آئے گا۔ اس کی نظر اس خبر پر پڑ گئی تو؟ باپ رے باپ! اب اسے کون بچائے گا؟ اس کا گلا ہی گھونٹے دے گا وہ! چھرا تو ہمیشہ اس کی جیب میں رہتا ہے۔ مٹرو آکب تک بچا پائے گا اسے؟ اسے تو وہ ایک ہی دھکے میں دور پھینک دے گا۔ ہے بھگوان! کیا کیا جائے اب؟ گینسی کو لگا اخبار میں وہ خبر اس کی موت کا پیغام لے کر آئی ہے۔

اس نے مٹرو آکو آواز دی۔ وہ دوڑا دوڑا آیا تو گینسی کو سوچا نہیں کہ اس سے کیا کہے؟ خواہ مخواہ ایک کپ چائے اور بنالائے کو کہہ دیا۔

اس خبر کو اس نے ایک مرتبہ اور پڑھا۔ دوسری خبریں پڑھنے کو اس کا دل ہی نہیں ہوا۔ اخبار موڑ کر رکھ دیا اس نے۔ اسی وقت اپنے ایک دوست کے ساتھ مٹن ما کو آتے دیکھا۔ ہڑبڑا کر اس نے اخبار کو کہیں چھپا دینا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا۔ مٹن ما دوست کے ساتھ اندر داخل ہو چکا تھا۔ گینسی نے سوچا وہ اخبار کو جلا ڈالے مگر پھر خوف دامن گیر ہوا کہ مٹن ما نے دیکھ لیا تو؟ تو پھر.... تو پھر.... اچھا وہ اس اخبار کو پرانے اخباروں کے درمیان چھپا کے رکھ دے گا۔ وہ مٹن ما کے باہر جانے کا انتظار کرنے لگا۔ مٹرو آنے شاید ان دونوں کے لئے بھی چائے کا پانی رکھ دیا تھا۔

مٹرو آ چائے لے کر آیا تو گینسی کا دل پھر سے اخبار پڑھنے کا ہوا مگر اس نے اس خواہش کو زبردستی پھیل دیا۔ اسے اخبار کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ مٹن ما گھر ہی میں تھا۔ اس کا کیا، اچانک ٹپک پڑتا اور اخبار لے کر خود پڑھنے لگتا۔ ویسے اخبار و اخبار میں اب اس کی دلچسپی نہیں ہے۔ پہلے تھی، جب ملازمت کے اشتہار ڈھونڈ ڈھونڈ کر درخواستیں بھیجا کرتا تھا۔ ملازمت آج کل آسانی سے نہیں ملتی۔ وہ زمانہ اور تھا۔ سفارش،

رشوت ان دنوں بھی چلتی تھی مگر آج کی طرح نہیں تھی۔ اب تو باپ بڑا نہ بھیا، سب سے بڑا روپیہ چلتا ہے بلکہ باپ بڑا نہ بیٹا کہنا زیادہ مناسب ہے۔ گراموفون کے ریکارڈ کی طرح سوئی ایک جگہ رُک گئی، باپ بڑا نہ بیٹا.... باپ بڑا نہ بیٹا....

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے گینسی کا دل چاہا کہ اخبار پورا پڑھ لے لیکن پھر خیال آیا رسک لینا ٹھیک نہ ہوگا۔ اخبار بعد میں بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ آفس میں پڑھ لے گا۔ وہاں بھی تو آتا ہے۔ مٹرو آ کی ماں نے ایک مرتبہ صلاح دی تھی۔ اس کی عقل کے حساب سے صلاح مناسب ہی تھی۔ کہا تھا، جب آفس میں اخبار آتا ہے تو وہیں بیٹھے بیٹھے کیوں نہیں پڑھ لیتے جو یہاں بھی اٹھونا، لگا رکھا ہے۔ بے مطلب، فالٹو کا خرچ۔

وہ بیچاری کیا جانے کہ آفس میں ایک بابو کے ہاتھ سے دوسرے اور دوسرے کے ہاتھ سے تیسرے بابو کے پاس جاتے جاتے اخبار کہاں غائب ہو جاتا ہے، اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جب تک اس کی باری آئے گی اخباری چندی چندی ہو جائے گا اور مان لو، کبھی پہلے ہی بل جائے تو آفس کے اسٹول پر صاحب کی گھنٹی کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے اخبار پڑھنے کا کیا مزہ؟ اپنے ڈیرے پر بے فکر ہو کر پڑھنے میں جو مزا ہے اس کی بات ہی اور ہے!

مٹرو آ کی ماں اسے اخبار پڑھتا کر چڑھتی اور کہتی، اتنا پیسہ بے برابر دکرے ہی، ایک بار پچھو سے کونو من کام کرت سے نہ لی۔ تب گینسی دل ہی میں مسکرا کر کہتا، کم عقل عورت! تم کیا جانو! اخبار کتنی اچھی چیز ہے۔

سچ! اخبار گینسی کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ اب تو پہلے سے زیادہ بڑا سہارا بن گیا ہے۔ اسی لئے ساگ، سبزی، کپڑے، لتے میں کٹوتی اسے منظور ہے لیکن اخبار خریدنا کبھی اس نے فضول خرچی میں شمار نہیں

کیا۔ بھئی، دلش دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے اور بہت نہ سہی، رڈی میں بیچ کر کچھ پیسے بھی تو حاصل ہو جاتے ہیں اور پھر جاڑے کی دھوپ میں بیٹھ کر چائے کی چسکیوں کے ساتھ اخبار پڑھنے کا مزا! اس کی تو کوئی قیمت ہی نہیں۔

لیکن گینسی کی اس خوشی میں آج خلل پڑ گیا ہے۔ پتہ نہیں کیسے وہ خبر اخبار میں چھپ گئی۔ جتنا اسے دل و دماغ سے نکالنا چاہا وہ چپکتی گئی۔

مٹرو آ آیا تو پوچھا، 'بابو جی! آج آفس نہیں جائیں گے کیا؟ کب تیار ہوں گے؟' گینسی نے پوچھا، تمہارا بھیا کیا کر رہا ہے؟ 'ارے! ابھی تو وہ اور اس کا دوست آپ کے سامنے سے نکل کر باہر گئے ہیں۔'

گینسی خیالات میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ واقعی اسے پتہ ہی نہیں چلا مگر اپنی یہ بھول اسے کچھ ٹھیک نہیں لگی۔ اسے اتنا بے خبر نہیں رہنا چاہئے۔

اس نے مٹرو آ سے پوچھا، 'کھانا بن گیا؟' 'آپ نہ مائیے، تب تک بن جائے گا۔' گینسی اٹھ گیا۔ نہانے کے لئے ٹل پر جانے سے پہلے مٹرو آ کی آنکھ بچا کر اخبار اس نے پرانے اخباروں میں گھسا کر رکھ دیا لیکن اخبار کی جو خبر اس کے دل پر نقش ہو گئی تھی اس کا وہ کیا کرے؟ آفس میں بھی یہی خیال دماغ میں چکر کاٹتا رہا۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ اخبار والی خبر کا پس منظر اس کے اپنے پس منظر سے کتنا میل کھاتا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے حالات کو ہو ہو خبر میں اتار دیا گیا ہو۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ حالات ایک جیسے ہوں تو انجام بھی ایک جیسا ہی ہوگا۔ خبر میں حالات وہی، ماحول وہی، کردار وہی ہیں تو انجام کو اپنا انجام کیوں نہ سمجھ لے؟ جب اس نے یہ خبر پڑھی تھی تو ایک دم خوفزدہ ہوا تھا مگر اب وہ سوچ سمجھ کر اس پر غور کر رہا ہے۔ اب اس کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ مٹن ما پہلے ایسا نہیں تھا۔ بی اے سکینڈ ڈویژن پاس ہوا تھا مگر جب کئی جگہ

انٹرویو دینے اور کئی جگہ اچھا انٹرویو دینے کے بعد بھی کہیں ملازمت نہیں ملی تو اس کا بھروسہ اٹھ گیا۔ وہ باغی ہو گیا۔ گینسی سمجھتا ہے اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ آدمی آخر کہاں تک برداشت کرے گا۔ ستم یہ ہوا کہ اس دوران من چن ما کے دماغ میں یہ خرافات جانے کہاں سے راہ پا گئی کہ اس کے ساتھ جو نا انصافی ہوئی ہے اس کا ذمہ دار اس کا اپنا باپ ہے۔ اب اس کا ہے کوئی جواب؟ جہاں تک سفارش کی بات ہے اس نے اپنے طور پر پوری کوشش کی، اپنے صاحب سے بھی اور دوسرے سوریسز سے بھی لیکن ہر جگہ ہزاروں میں رشوت مانگی جاتی۔ وہ آخر دس بیس ہزار کا انتظام کہاں سے کرتا؟ منچن مانے دل میں گانٹھ باندھ لی کہ اس کا باپ اس کے لئے روپیہ خرچ کرنے کو تیار نہیں۔ اس کا غصہ کبھی کبھی اتنا بڑھ جاتا کہ باپ کے منہ پر کہہ دیتا، تم مر جاؤ تو تمہاری جگہ مجھے ملازمت مل جائے۔ ویسے بھی سال ڈیڑھ سال میں رٹائر ہونا ہی ہے۔ گینسی کے دل میں کئی مرتبہ خیال آیا کہ کاش! جھگوان سچ سچ اسے اٹھا لیتے۔ مگر مرنا کیا اپنے ہاتھ میں ہے؟ اب وہ اگر جی رہا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اسے اپنی پتی سے حسد ہوتا ہے۔ مر کر کم سے کم وہ اس ایمان سے تونچ گئی۔

گینسی کو لگتا ہے کہ اگر وہ واقعی مر جائے تو کوئی مضا لفقہ نہیں بشرط یہ کہ منچن ما کو ہمدردی کے تحت ملازمت ملنا طے ہو۔ ابھی جو حالات ہیں ان میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ قانون قاعدے اپنی جگہ مگر ہوتا وہ ہے جو صاحب لوگ چاہتے ہیں۔ حالات اتنے سنگین ہیں کہ چیرا اسی اور دربان تک کے لئے منتری اور کھ منتری کے فون آتے ہیں۔ ایسے تو گینسی کا باپ بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ گینسی لال کی کیا بساط؟ لیکن بیٹا یہ سمجھتے تبا!

غصہ میں بیٹا باپ کو مار ڈالے، یہ بات بعد از قیاس ہے مگر وہ بھی تو ماں کا بیٹا تھا جس نے ایسا شرمناک

کام انجام دیا۔ حقیقت ہی خبر بناتی ہے اور خبر حقیقت بنتی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ فلمیں دیکھ کر جرائم کرتے ہیں اور پکڑے جانے پر قبول کرتے ہیں کہ جرم کرنے کا خیال انہیں فلاں فلم دیکھ کر آیا۔ گینسی جانتا ہے کہ وہ چاہے کچھ سوچے، جو ہوگا اسے وہ روک نہیں پائے گا۔ جھگوان کی مرضی کو وہ مقدم جانتا ہے۔ اخبار چھپا دینے سے کیا ہوگا؟ بیٹے کے ہاتھوں مرنا اگر اس کی قسمت میں ہے تو اسے یہ منظور ہے۔ ہاں مرتے وقت اسے ایک دکھ ضرور رہے گا کہ مٹرو آجسے اس وقت اسکول میں پڑھائی کرنی چاہئے تھی، اس کی وجہ سے گرسہتی کے کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔ اس نے اپنے اس بیٹے کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ کسی انگریزی اسکول میں نہ سہی، سرکاری اسکول میں تو داخلہ کروا سکتا تھا اس کا۔ بس اتنا فرق پڑتا تھا کہ اسے آفس سے پہلے اور بعد میں رسوائی بھی سنبھلانی پڑتی۔ تو کیا ہوتا؟ اپنے بیٹے کے لئے، اس کے روشن مستقبل کے لئے کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا تھا؟

اسکول میں گینسی نے سنسکرت کا ایک شلوک پڑھا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ پوت (بیٹا) بھلے ہی کیوت (برا) نکل جائے ماما کبھی کماتا (خراب ماں) نہیں ہوتی۔ اسی طرز پر گینسی نے سوچا باپ کبھی لباپ نہیں ہوتا، بیٹا چاہے کتنا ہی کیٹا بن جائے۔ گینسی نے فیصلہ کر لیا کہ مٹرو آب رسوائی کا کام نہیں کرے گا۔ وہ اسکول جائے گا۔ گینسی اسے پنسل، کاپی، کتاب خرید کر لادے گا کیونکہ اس کے مستقبل کے دروازے بند کرنے کا کسی کو اختیار نہیں، اس کے باپ کو بھی نہیں۔ ابھی تک اس نے مٹرو آ کی پڑھائی کی طرف سے غفلت برتی تھی کیونکہ اس میں اس کی غرض پوشیدہ تھی لیکن اب آگے ایسا نہیں ہوگا۔ لمحہ بھر کے لئے گینسی کو یہ خیال آیا کہ مٹرو آ پڑھ لکھ کر کہیں منچن ما کے راستہ پر نہ چل پڑے۔ منچن ما کو ملازمت نہیں ملی تو اسے مل جائے گی اس کی کیا گارنٹی؟ وہ بھی باپ سے نفرت کرنے لگے تو؟ مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے ان

بیکار خیالات کو دماغ سے جھٹک دیا۔ اسے ایسی فضول باتیں نہیں سوچنا چاہئے۔ اسے اپنے باپ ہونے کا فرض نبھانا چاہئے۔ بیٹے کا فرض بیٹا جانے۔

گینسی آفس سے لوٹا تو کافی مطمئن تھا۔ دور ہی سے اس نے دیکھا کہ منچن ما اپنے دو مسٹنڈے ساتھیوں کے ساتھ باہر کی چوکی پر بیٹھا تھا۔ اس کے قدم تھمنے لگے کیونکہ منچن ماشا کو کبھی گھر میں نہیں رہتا تھا۔ وہ آگے بڑھا مگر اس کے پاؤں میں جیسے طاقت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ تھوڑا اور آگے بڑھا تو دیکھا منچن ما کے سامنے آج کا اخبار کا پہلا صفحہ کھلا پڑا تھا۔ اسے یہ اخبار کہاں سے ملا؟ گینسی تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوا تاکہ دیکھے کہ پرانے اخباروں کے بنڈل میں اس نے جو اخبار چھپا دیا تھا وہاں ہے یا نہیں؟ مگر وہ ایسا نہیں کر سکا کیونکہ مٹرو آ وہیں آ بیٹھا تھا۔ باپ کو اندر آتے ہی اخبار الٹ پلٹ کرتے دیکھا تو اسے اٹ پٹا لگتا۔

باپ کو آیا دیکھ مٹرو آ نے کہا 'آگلیہو بابو جی، چاہ بنوے چھہو؟' اور اٹھ کر رسوائی میں چلا گیا۔ گینسی نے جو تے اتارے اور نڈنہال ہو کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس میں اب اتنی طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ اخبار کے بنڈل میں سے اخبار ڈھونڈتا۔ اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے کہ منچن ما کو اخبار کہاں سے ملا؟ اس نے بنڈل میں سے نکالا یا خرید کر لایا ہے۔ اس کے دماغ میں اس خبر کی سرخی گھوم رہی تھی۔ ہمدردی کی بنا پر ملازمت حاصل کرنے کے لئے باپ کا قتل

اس نے آنکھ اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ منچن ما ابھی تک اندر نہیں آیا تھا مگر وہ کسی بھی لمحہ اندر آ سکتا ہے۔ دروازے کی طرف سے آنکھیں پھیر لینے پر بھی وہ منچن ما کو اندر گھستے دیکھ سکتا ہے۔ اس نے چیخ کر مٹرو آ کو بلایا۔ وہ دوڑ دوڑ آیا تو اس کا ہاتھ گینسی نے مضبوطی سے تھام لیا جیسے اس بیٹے کی ہمدردی ہی اب دوسرے بیٹے سے اس کی حفاظت کر سکتی ہے۔

□□□



فصرت ظہیر

C280، سکیٹیڈ فلور، خسرو پارٹمنٹ، شاہین
باغ، نئی دہلی، موبائل: 9716145593

پہلا روزہ اور رمضان کی کچھ یادیں

بڑا سا رجسٹراٹھائے نعین پڑھتے ہوئے آہستہ قدموں سے آ رہے ہیں اور ان کے پیچھے بیس تیس لوگوں کی ایک ٹولی لے میں لے ملا کر نعتوں کے مصرعے اٹھاتی ہوئی سڑک سے گزر رہی ہے... ”یا نبی سلام علیک۔ یا حبیب سلام علیک یا رسول سلام علیک صلوات اللہ علیک...“ سحری میں آنکھ کھلنے پر رات کی خاموشی میں دور سے آتی ہوئی ناظم خاں اور ان کے ساتھیوں کی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز... ”الوداع اے ماہِ رمضان الوداع“ سن کر دل جیسے غم سے بھر جاتا تھا۔ اور پھر آخری افطار کا منظر... بڑی سی سفید چادر پر افطاری سے سجا ہوا پڑ بہار دسترخوان... روزہ کھولنے کے وقت کا اعلان کرنے والے گولے کے دغنے کا انتظار... اور اس انتظار پر غالب آجانے والا یہ احساس کہ کل سے یہ دسترخوان یوں نہیں سجے گا... عید کے چاند کی خوشی بھی کچھ کم ہی ہو جاتی تھی... یہ باتیں تب کی ہیں جب کوئی مہمان آتا تھا تو دل خوش ہوتے تھے اور جاتا تھا تو آنسوؤں سے رخصت کیا جاتا تھا۔ آج اس سب کی فرصت کہاں۔ اور ہو بھی تو خیال کسے آتا ہے۔ ان دنوں کی بات ہی اور تھی۔ محمد رفیع کی آواز میں:

کرتا ہے ایک راوی دل سوز یہ بیاں
رمضان کے مہینے کی مشہور داستاں

مذہبی کتابچوں اور مسجد کے مولوی صاحب کی نصیحتوں سے کہیں زیادہ دل کو چھو لینے والے اس گراموفون ریکارڈ نے چھ سات سال کی عمر میں روزہ رکھوا دیا تھا... اسی واقعے پریشان ہو گئی تھی... ”روزہ نہیں

ایک ماننے ہیں اور شادی مرگ ہو جاتے ہیں۔ استغفر اللہ! اس تمام خرافات اور بیہودہ گوئی کو ہمیں لگام دے کر اُس واقعے کی طرف آتے ہیں جو مسلمان کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ جانے والا اس کی زندگی کا پہلا اہم واقعہ ہے لیکن پہلے چند باتیں رمضان کے اس مبارک مہینے کے بارے میں جس میں عموماً یہ واقعہ وقوع پذیر ہوتا اور جو مہینہ کم، مہینے بھر کا تہوار زیادہ ہے۔ پہلے دن سے ہی یہ مہینہ پورے ماحول کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ مذہبی طور پر بھی اور سماجی طور پر بھی۔ کھانے پینے اور سونے جاگنے کے معمولات ہی نہیں عادتیں بھی بدل جاتی ہیں۔ بازاروں میں کچھ زیادہ رونق آ جاتی ہے۔ چہرے کچھ زیادہ پرسکون نظر آنے لگتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اس مہینے سے ہی کچھ ایسی انسیت ہو جاتی ہے کچھ مت پوچھئے۔ برسوں پہلے کے وہ شب و روز آج بھی میری یادوں میں محفوظ ہیں جب رمضان کا آخری ہفتہ آتے آتے روزہ داروں کے چہروں پر چمکنے والی پر نور نقاہت میں افسردگی کی بھی ایک لکیر نمایاں ہونے لگتی تھی۔ یہ احساس کہ بس اب چند روز میں سحر و افطار کا یہ سلسلہ منقطع ہو جائے گا لوگوں کو اکثر اداس کر دیا کرتا تھا۔ رمضان کی آخری سحری کی راتوں میں ہمارے پڑوسی ناظم علی خاں مرحوم کی میلاد پارٹی جب سہارنپور کی سڑکوں پر وداع نامہ گاتے ہوئے گزرتی تھی تو دل پر ایک عجیب ہی اثر ہوتا تھا۔

گہری سیاہ رات... آگے آگے کوئی بڑا سا پیٹرو میکس لمپ کا ندھے پر اٹھائے چل رہا ہے، اس کی روشنی میں ناظم خاں اور ان کے ایک خوش الحان دوست... غالباً راؤ مسرور خاں... میلاد کے نعتیہ کلام کا

آدمی اگر انسان ہو تو ایک واقعہ اور مسلمان ہو تو دو واقعے کبھی نہیں بھولتا اور دوسرا واقعہ ہے پہلا روزہ۔ آپ پوچھیں گے پہلا واقعہ کون سا ہے، تو پیلز یہ سوال مجھ سے کر کے خود ہی شرمندہ نہ ہوں۔ خاص طور سے شادی شدہ بزرگان کرام۔ و جاس کی یہ ہے کہ زندگی کے اس مرحلے کو انھوں نے قاضی اور دو گواہوں کی موجودگی میں بسر و چشم خود ہی قبول کیا تھا اور بڑی دھوم دھام سے اپنے انتقال پر ملال کا جشن منایا تھا۔ ویسے پچھتاوا تو غیر شادی شدہ بزرگوں کو بھی ہوتا ہے کیونکہ یہ ہے وہ لڈو جسے کھائے گا تب بھی پچھتاوے گا اور نہ کھائے گا تب بھی پچھتاوے گا۔ کئی لوگ یہ فلسفہ بگھارتے ہیں کہ اگر پچھتاوانا ہی ہے تو آدمی لڈو کھا کر ہی کیوں نہ پچھتاوے۔ میرا خیال ہے ایسے لوگ بعد میں زیادہ پچھتاتے ہیں۔ مشکل دراصل یہ ہے کہ زندگی اپنے اہم ترین معاملوں میں آدمی کو تجربے کا موقع نہیں دیتی۔ خاص طور پر ہمارے یہاں مشرق میں لوگوں کو شادی سے پہلے شادی کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ جب کہ مغرب میں رواج یہ ہے کہ شادی بہت سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے۔ پہلے میاں بیوی ایک دوسرے کو خوب ٹھوک بجا کر دیکھ لیتے ہیں، سچے پیدا کرتے ہیں اس کے بعد ہی عموماً کسی اور سے شادی کرتے ہیں، پہلے نہیں۔ آفیشیل شادی سے پہلے نان آفیشیل شادی کا یہ رواج خیر سے اپنے یہاں بھی داخل ہو گیا ہے مگر افسوس ابھی تک پوری طرح پھیلا نہیں ہے۔ اس کے بعد زندگی کا دوسرا اہم ترین معاملہ موت ہے۔ اس کا بھی لوگوں کو کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو شادی اور مرگ دونوں کو

ہے فرض ابھی تجھ پہ میرے لال...

لیکن والد صاحب خوش تھے... دوپہر بعد تو پوری گلی میں خبر پھیل گئی... بابوعزیز کے لڑکے نے پہلا روزہ رکھ لیا ہے... ارے اتنی گرمی، اور اتنا دبلا پتلا سا تو ہے... دلہن اسے گھر کے اندر ہی رکھو۔ باہر مت نکلنے دینا۔ اچھا... سو رہا ہے، چلو سونے دو جگنا مت... مگر روزہ دار بچہ آنکھ میچے نہ صرف جاگ رہا ہے بلکہ اندر ہی اندر خود کو ڈانٹ بھی رہا ہے کہ بے وقوف، کیا ضرورت تھی شیخی بگھارنے کی! اب بھگت... گولا چھوٹنے میں پورے پانچ گھنٹے باقی ہیں۔ پانی تو خیر سحری میں خوب پیا تھا۔ عام دنوں سے دگنا، کہ رنج صاحب بار بار یاد دلا رہے تھے:

پانی بغیر پیاس سے خشک ہو گیا گلا کم سن تھا نازمین تھا چکرا کے گر پڑا اس لیے پیاس تو اتنی نہیں لگ رہی تھی۔ لیکن بھوک... سحری کے پراٹھے اور کھجلا بھینی، بند آنکھوں میں گھومنے لگتے تو خالی پیٹ جیسے درد کا آسمان بن جاتا تھا... بھوک کا درد... دنیا کا سب سے بڑا درد... یوں کہیے کہ تمام دردوں کا مغل اعظم، جس کا علاج ہمدرد دو خانہ وقف کے پاس بھی نہیں۔ اور ایک گھنٹے بعد تو درد باقاعدہ آنسوؤں میں ڈھلنے لگا۔ دائیں ہاتھ کی آستین گیلی ہونے لگی... لیکن اس پدی سے بچنے کی ہوشیاری ملاحظہ فرمائیے۔ جہاں کوئی کمرے میں داخل ہوا جھٹ کروٹ بدل لی اور ایسے بن گئے جیسے کبھ کر کے بھی باپ ہوں...

آخر... دوپہر ڈھل کے عصر کا جب وقت آ گیا... ملنے والے آنے لگے۔ جسے دیکھے ہاتھ میں افطاری کا سامان لیے چلا آ رہا ہے۔ عورتیں اندر کمرے میں آ کر روزہ دار بچے کی زیارت کرنے لگیں۔ اور زیارت ہی نہیں ہاتھ سے چھوتی بھی جاتیں۔ سر پر ہاتھ پھیرتیں۔ بے بے دیکھو تو کیسا مزے سے سو رہا ہے، ماشا اللہ... بڑا جی دار بچہ ہے تمہارا آپا

ابینہ... اب نور جہاں خاتون کو یہ کون بتاتا کہ جی دار بچہ دراصل مارے شرم کے دبا پڑا ہے، ورنہ اس کا بس چلے تو کیسا روزہ کیسے رمضان اور کہاں کے محمد رنج۔ سیدھا دوڑ کر باورچی خانے میں گھس جائے اور دو گھنٹے تک خود کو وہیں اندر سے بند کیے رکھے۔ اوہو، تو اس والے نے روزہ رکھا ہے۔ میں تو اسے یوں ہی باؤلا سمجھتی تھی۔ یہ تو بڑا اللہ والا نکلا... وہ تو ٹھیک ہے مگر عصر کا وقت ہو چلا، اب اسے نماز کے لئے اٹھادینا چاہیے... تم بھی کیا بات کرنی ہو رقیہ... ابھی سات آٹھ سال کا ہی تو ہے... ہاں بھی، بچوں پر نماز کہاں فرض ہے۔ ان کی نماز پڑھنا تو فرشتوں کے ذمے ہے... مگر یہ تو دیکھو، گرمیوں کا روزہ ہے۔ بی بی میں تو کہتی ہوں بچے کو درود شریف پڑھ کے شربت پلا دو... بے چارہ ننھی سی جان۔ اب تک تو اس کا روزہ قبول بھی ہو چکا ہوگا...

ننھی سی جان کی جان میں جان آئی... آنکھوں میں بند آسمان سے شربت روح افزا کی برسات ہونے لگی... نہیں بھئی، ایسا نہیں کرتے۔ ہمت والا بچہ ہے۔ بس ڈیڑھ دو گھنٹے ہی تو بات ہے... ہاں بھی ہاں رقیہ آٹھیک کہہ رہی ہیں... کہیں روزہ توڑوانے کا عذاب نہ گلے پڑ جائے... ہمت والے بچے کے جی میں آیا کہ ابھی چھت پر سے کوئی ڈنڈا لاکر پوری طاقت سے خالہ رقیہ کی کمر پر دے مارے... مگر جی مسوس کر رہ گیا۔

گھر میں آہستہ آہستہ اتنے لوگ آپکے تھے کہ کسی سے چھپ کر کچھ کھالینے کا بھی موقع نہیں تھا۔ بابو جی سہارا سادے کرھن میں لائے تو ہر طرف چار پائیاں بچھی تھیں جن پر سفید چادروں کے اوپر طرح طرح کی پلٹیں، تھالیاں، سینیائیں، رکابیاں اور ڈونگے ڈھکے ہوئے رکھے تھے... یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر پتہ نہیں کہاں سے پانی کے سوتے جاگ اٹھے اور خشک گلا کچھ ایسا تر ہوا کہ کھانسی کا پھندہ لگ گیا... پھر ان تھالیوں اور ڈونگوں کا سامان ایک بہت بڑے دسترخوان پر سجایا جانے لگا تو جیسے آسمان چاند

ستاروں سمیت زمین پر بچھ گیا۔ کیا ہے جو نہیں تھا... پھلکیاں، کچوریاں، پالک کے پکوڑے، آلو کی پکوڑیاں، شکر پارے، برنی، امرتی، جلیبیاں، نمک پارے، تلے ہوئے چنے، بھنا ہوا قیمہ، آم، امرود، خر بوزہ، زردہ، پلاؤ، قورمہ، نان، کو فنتے... کہاں تک یاد کیجئے... کچھ اپنے گھر کا، باقی سب دوسرے گھروں کا... روزے دار بچے نے اپنی ضد میں اٹی اور بابو جی کو پہلے سے کچھ تیاری، اور اوٹل روزہ کشائی پر لوگوں کی باقاعدہ دعوت کے اہتمام کا موقع ہی کہاں دیا تھا... لیکن لمبی سی گلی کے پڑوس نے اس کی ضرورت ہی ختم کر دی... وہ گلی جس کی ناک خود اس کی لمبائی سے بھی اتنی زیادہ لمبی تھی کہ ہر گھر کے اندر کوٹنے کھد رے میں چھپی خوشی یا غم کو بھی دوسرے سے سونگھ لیتی تھی۔

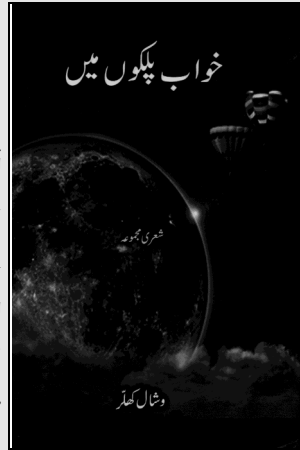
اس شام کب افطار کا گولا ڈغا، کیسے روزہ کشائی ہوئی، منہ اور معدے میں ذائقوں کی کیسی آتش بازیاں چھوٹیں... کچھ یاد نہیں... بس وہ گلی اور اس کا دسترخوان حافظے میں روشن ہے۔ روزہ دار بچہ آج دہلی شہر کے ایک عالی شان علاقے میں دوسری منزل کے فلیٹ نمبر 37 میں رہتا ہے جہاں اسے یہ نہیں معلوم کہ 36 نمبر میں کون مقیم ہے اور 38 نمبر میں کس کی رہائش ہے؟ ہر روز اڑے سے روزانہ کچھ چہرے باہر نکلتے ہیں، پھر پتہ نہیں کہ ان ہی دروازوں کے پیچھے جا کر گم ہو جاتے ہیں۔ خیر... اچھا تو میاں قبلہ محترم رمضان شریف صاحب، بہت مسخ خراشی ہوئی۔ اب آپ خیر سے جائیے۔ آپ نے ہمیں خوش رکھا، خدا آپ کو خوش رکھے۔ زندگی رہی تو اگلے سال پھر ملاقات ہوگی۔ بس اتنی ہی گزارش ہے کہ اس بار شریف لائیں تو اللہ میاں سے کسی ایسی منزل یا فلیٹ کا پتہ ضرور لے کر آئیں جہاں چہرے اجنبی، دروازے نا آشنا اور کھڑکیاں گونگی بہری نہ ہوں... جہاں 36، 37 اور 38 سب ایک دوسرے کو جانتے ہوں... سب کے پاس ایک دوسرے کو جاننے کا وقت ہو... خدا حافظ...! الوداع! الوداع! □□□

کتابیں اصل میں پہچان ہیں تخلیق کاروں کی...!!

ماہنامہ نیادور، کوئٹہ، تحقیقی، تخلیقی اور ادبی صحافت سے متعلق کتابیں خاصی تعداد میں موصول ہو رہی ہیں۔ یہاں پر موصول ہونے والی کتابوں کی فہرست سازی کی جاتی ہے۔ پھر اسی اندراج نمبر کے تحت ان کتابوں کو تبصرے کے لئے بعض مبصرین کو دی جاتی ہیں۔ کسی موصول ہوئیں۔ جن میں صرف شاعری کی دیگر اصناف سے متعلق ۸۴ شعری مجموعے شامل ہیں۔ ایک اور بات جو قابل ذکر ہے۔ جس کا یہاں پر تذکرہ کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا۔ نیادور کو جو کتابیں موصول ہوئی ہیں، ان ساری کتابوں پر تبصرہ کرنا ایک ناگزیر عمل ہے۔ لیکن ماہنامہ

”ہجوم آئینہ“ یہ شعری مجموعہ ڈاکٹر فرید پربتی کا ہے، جو ۲۵۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں نعت، حمد، دعا، غزلیں اور قطعات کے علاوہ دیگر موضوعات سے متعلق اشعار موجود ہیں، اور اس مجموعہ میں ڈاکٹر فرید پربتی کی شاعری سے متعلق کچھ اہم ناقدین اور دانشوروں کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰۱۰ء میں ہوئی ہے اور اس کتاب کی قیمت ۵۰۰ روپیہ ہے۔

”خواب پلکوں میں“ یہ شعری مجموعہ وشال کھلر کا ہے۔ اس مجموعے میں کل ۵۴ غزلیں، ۳۹ نظمیں اور ۷ نثری نظمیں شامل ہیں۔ ان کا غزلوں کا مزاج کلاسیکی ہے۔ لیکن لفظوں کے انتخاب اور اس کی نشست و برخاست سے غزلوں کی فضا میں نئے پن کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں استعمال ہونے والے موضوع کو اچھے انداز سے برتنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن ان کے بعض اشعار ایسے ہیں جس کی برجستگی لوگوں کو اپنی طرف ضرور متوجہ کرتی ہے۔ اس مجموعے میں موجود زیادہ تر غزلیں لہجہ و آہنگ استنبہامیہ ہے۔ جس کی وجہ مبذول کرنے میں ایک حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔ اس مجموعے میں موجود نظموں کا اپنا ”لہو بور ہا ہوں“ جھیل کے کنارے“ ”احتجاج“ جب لفظ کی وادی میں“ نظموں لگا سکتے ہیں کے اس کے موضوعات کیا ہیں، مماثلت و مناسبت رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں اور انکا آہنگ و اسلوب کافی توانہ محسوس نظموں سے زیادہ ہمہ آہنگ نظر آتا ہے۔



اس مجموعے میں موجود نثری نظمیں میں وہ توانائی اور لہجہ کا وہ تیور محسوس نہیں ہوتا جیسا کہ ان کی غزلوں اور معری اور غیر معری نظموں میں ہے۔ اس لئے نثری نظمیں اپنے متن اور معنی کے اعتبار سے اپنا تا دیر تاثر قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا سرورق کافی دیدہ زیب ہے۔ اس کتاب کی قیمت ۳۰۰ روپیہ درج ہے۔ وشال کھلر ابھی ایک نوجوان شاعر ہیں۔ اس سے پہلے ان کے ایک شعری مجموعہ ”دھند میں آماں“ پربساتیہ اکادمی کی طرف ۲۰۱۱ء میں ”یو اے پبلسنگ“ نواز جا چکا ہے۔

مبصر کو کتاب دینے سے پہلے اس بات کا ضرور خیال رکھا جاتا ہے، کہ تبصرہ نگار کو اسی موضوع کے مطابق کتابیں دی جائیں۔ جس میدان میں اُسے مہارت حاصل ہو۔ چاہے وہ فکشن نگاری کا میدان ہو یا تحقیق و تنقید کا یا شاعری کا۔ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے۔ تاکہ تخلیق کار کی تخلیق کے ساتھ کسی طرح کی ناانصافی کا کوئی امکانی جواز باقی نہ رہ جائے۔ تبصرے کے لئے دی جانے والی کتاب جب ہمیں مبصر کی تحریر کے ساتھ

”قص صدأ“ یہ شعری مجموعہ ڈاکٹر معظم علی خاں کا ہے۔ اس مجموعہ کو مصنف نے اپنے والدین اور اپنی اہلیہ مرحوم کے نام انتساب کیا ہے۔ اس مجموعہ میں پیش لفظ ”اسلم حنیف“ نے لکھا ہے اور پروفیسر وحید الظفر خاں نے ان کی شاعری سے متعلق ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا

نیادور کی شروع سے یہ کوشش رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتابوں پر تبصرہ شائع ہو سکے۔ اس لئے ہم مسلسل اپنے ہر شمارے میں تبصرے میں کچھ کتابوں کو ضرور جگہ دیتے ہیں۔ اس سے پہلے دسمبر ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ”ایئر انڈر“ میں کچھ خاص کتابوں کو شامل کیا

موصول ہو جاتی ہے، تب کہیں جا کر ہم نیادور کے تبصرے کے کالم اس کی اشاعت کا اہتمام کرتے ہیں۔ جیسا کہ نیادور کے بیشتر شمارے میں آپ تبصرجات والے کالم میں مختلف کتابوں پر تبصرہ ملاحظہ کرتے ہیں۔ گزشتہ ایک برس میں نیادور کو ۱۵۰ کتابیں

ہے۔ اس مجموعہ میں شاعر نے ”اپنی بات“ کے عنوان سے اپنا اور اس کتاب کا ایک تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ اپنے روایتی انداز کے مطابق اس کا آغاز مناجات اور نعت جیسی پاکیزہ صنف سخن سے کیا ہے۔ اور اس میں شاعری کی دیگر اصناف سخن سے متعلق بھی اشعار موجود ہیں کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

شاعری کے بارے میں کبھی کبھار ہم چیزیں بیان کی ہیں۔ ”گیت بھی تو، غزل بھی تو“ یہ شعری مجموعہ سعید راشد کا ہے۔ جو اپنے صوری اور معنوی حسن کے مطابق قابل دید ہے۔ اس کتاب کے شروع میں کچھ ہم مضامین شامل ہیں جو مختلف دانشوروں نے ان کی شاعری سے متعلق

سے شائع ہوئی ہے۔ اس کی قیمت ۲۵۰ روپیہ ہے۔ ”روشنی کا سفر“ اس شعری مجموعہ کے خالق مہدی پر تاب گڑھی ہیں۔ اس کتاب کو ”نوناہالا قوم کے نام انتساب کیا گیا ہے۔ چونکہ تخلیق کار نے خاص طور سے بچوں کے اخلاقی کردار سازی، سبق آموز کہانیوں، پہیلیوں اور کہانیوں کو اپنی تخلیقی

اس کی قیمت 400 // روپیہ تجویز کی گئی ہے اس کی ترتیب و تدوین کا کام، مجیب شہز نے کیا ہے۔

”سفر آخری“ اس شعری مجموعہ کے خالق ڈاکٹر حفیظ آستانی ہیں، اور اس سے پہلے بھی ان کے ۳۴ شعری مجموعے ”افکار گریزاں“ ”خط و ضبط“ ”آدی درندہ ہے“ ”رقص عطش“ شائع ہو چکے ہیں۔

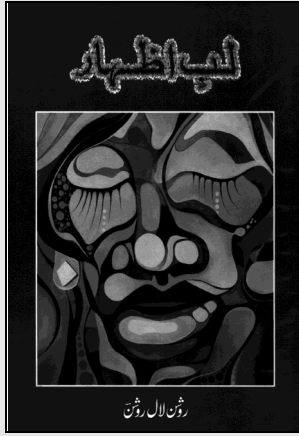
زیر تبصرہ شعری مجموعہ ”سفر آخری“ یوں کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ انھوں نے اپنے اس شعری مجموعہ کی ابتدا ”حمد“ سے کی ہے۔ اور اس م میں

”لب اظہار“ اس شعری مجموعہ کے خالق کا نام روشن لال روشن ہے۔ اس مجموعے میں کل ۱۱۹ غزلیں ہیں۔ یہ خالص غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں غزلوں سے پہلے تین صفحات پر مشتمل اردو زبان و ادب کے مشہور ادیب و نقاد شمس الرحمن فاروقی کا ایک توثیق نامہ بھی شامل ہے۔ جس میں شمس الرحمن فاروقی نے روشن لال روشن کی شاعری سے متعلق اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

روشن لال روشن چھوٹی بحروں میں اپنے مفہوم کی ترسیل بڑی فنی خوبیوں اور ندرتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ حالانکہ چھوٹی بحروں میں شعر کہنا تھوڑا دقت مجموعہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تک اشعار کے افاعیل کی بات ہے تو بحروں میں کافی شعر کہے ہیں۔

ان کی غزلوں کا لہجہ زیادہ تند کے اسلوب میں بڑا کٹاؤ ہے، جس کی تیز گام محسوس ہوتی ہے۔ اس مجموعہ تراکیب اور زیادہ بھاری بھر کم ہے۔ بعض مقامات پر خیال اور معنوی ترسیل مفقود ہو گئی ہے۔ جو ایک قسم کا سقم ہے۔ حالانکہ اس طرح کی کمیاں تقریباً سبھی شعرا کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

اس مجموعہ میں موجود غزلوں کے بعد کچھ متفرق اشعار بھی شامل کئے گئے ہیں۔ کچھ قطعاً کی صورت میں ہیں کچھ تین یا چار شعر کی شکل میں ہیں، جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جو غزلیں ابھی نہ مکمل تھیں اسے بھی اس مجموعہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا سرورق دیدہ زیبی کے ساتھ علامتی پیرایہ اظہار لئے ہوئے ہے۔



”لب اظہار“ اس شعری مجموعہ کے خالق کا نام روشن لال روشن ہے۔ اس مجموعے میں کل ۱۱۹ غزلیں ہیں۔ یہ خالص غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں غزلوں سے پہلے تین صفحات پر مشتمل اردو زبان و ادب کے مشہور ادیب و نقاد شمس الرحمن فاروقی کا ایک توثیق نامہ بھی شامل ہے۔ جس میں شمس الرحمن فاروقی نے روشن لال روشن کی شاعری سے متعلق اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

روشن لال روشن چھوٹی بحروں میں اپنے مفہوم کی ترسیل بڑی فنی خوبیوں اور ندرتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ حالانکہ چھوٹی بحروں میں شعر کہنا تھوڑا دقت مجموعہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تک اشعار کے افاعیل کی بات ہے تو بحروں میں کافی شعر کہے ہیں۔

ان کی غزلوں کا لہجہ زیادہ تند کے اسلوب میں بڑا کٹاؤ ہے، جس کی تیز گام محسوس ہوتی ہے۔ اس مجموعہ تراکیب اور زیادہ بھاری بھر کم ہے۔ بعض مقامات پر خیال اور معنوی ترسیل مفقود ہو گئی ہے۔ جو ایک قسم کا سقم ہے۔ حالانکہ اس طرح کی کمیاں تقریباً سبھی شعرا کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

اس مجموعہ میں موجود غزلوں کے بعد کچھ متفرق اشعار بھی شامل کئے گئے ہیں۔ کچھ قطعاً کی صورت میں ہیں کچھ تین یا چار شعر کی شکل میں ہیں، جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جو غزلیں ابھی نہ مکمل تھیں اسے بھی اس مجموعہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا سرورق دیدہ زیبی کے ساتھ علامتی پیرایہ اظہار لئے ہوئے ہے۔

ہنر مندوں سے اور فنکارانہ مہارتوں سے اسے شعر کے قالب میں بڑے خوبصورت پیرائے میں نظم کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں صاحبان فہم و فراست کے ان تاثرات کو بھی شامل کیا گیا ہے جو اس کتاب سے متعلق ہے۔ یہ مجموعہ ۱۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے آخری بیچ پر مصنف کی دیگر شعری تخلیقات کے نام بھی شامل ہیں جو اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ اس کی قیمت ۹۶ روپیہ درج ہے، اور اس کتاب کے ناشر خود

تحریر فرمائے ہیں۔ ان کے اس شعری سرمایہ میں ”حمد و نعت“ کے ساتھ صرف غزلیں ہیں۔ یہ مجموعہ ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں ایک صفحہ ”اغلاط نامہ“ کا ہے جس میں کتابت کی وجہ سے درآنے والی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی۔ یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک

غزلوں کے ساتھ کچھ مختلف عنوان سے نظمیں بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین، و شمال چند سہین نے فرمائی ہے۔ اس مجموعہ میں شاعر نے ”اپنی بات“ کے عنوان سے ایک صفحہ مختص کیا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے تعارف کے ساتھ اپنی

مصنف ہیں۔

”گفتگو“ یہ شعری مجموعہ حیدرعلوی کی بہترین شعری تخلیق کا منہ بولتا ہوا ثبوت ہے۔ اس مجموعہ مذکورہ کار سرورق انتہائی دیدہ زیب ہے، اور اس کے پس ورق کو شاعر کی تصویر کے ساتھ مختلف شعرا اور دانشوروں کے اقتباسات

شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ عمران راقم کا اس سے پہلے ایک شعری مجموعہ ”نئی آواز“ ۲۰۰۳ء میں شائع ہو چکا ہے، اور ایک افسانوی مجموعہ ”نجر آسمان کے نام سے زیر ترتیب ہے۔ یہ ماہنامہ ’صورت‘ کو لکاتہ کے مدیر ہیں۔ انھیں ان کی تخلیقات اور ادبی کاموں کے لئے دیگر اعزازات سے نوازا بھی جا چکا ہے۔

”نیاں اپنا“ یہ شعری مجموعہ ہوش نعمانی کا تخلیقی ورثہ ہے۔ جس کی ترتیب و ترتیب کا کام عبداللہ خالد نے انجام دیا ہے۔ اس مجموعہ کے ابتدا میں ہوش نعمانی کی شعری اور ان کی زندگی کے بارے میں کچھ خاص ادا با نواقدین کے تحریری تاثرات موجود ہیں۔ اس کے بعد اس کتاب کی ابتدا کا ایک صفحہ اور کتاب کے اختتامیہ کے دو صفحات تصویر کے لئے مختص کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں موجود غزلیں اس کی

تخلیقی سن اشاعت کے ساتھ ہر غزل کے اختتام پر درج کی گئی ہیں۔ اردو ادب کی دیرینہ روایت کی بنیاد پر غزلوں سے پہلے حمد اور نعت کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ کتاب کے پس ورق پر اس کتاب کے مرتب کی دیگر تالیفات و تصنیفات کا نام اور اس کی سن اشاعت درج ہے۔

والوں کے شکر یہ کے ساتھ اپنی شاعری سے متعلق کچھ اہم معلومات بھی اپنے قارئین کے لئے فراہم کی ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب و تنظیم کا کام مہتاب انور نے ڈاکٹر افسر کاظمی اور پروفیسر سید احمد بدر کی نگرانی میں انجام دیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔ اسکی قیمت ۱۵۰ روپیہ ہے۔

کے ساتھ مزین کیا گیا ہے۔ پس ورق کے ازتج پر رضوان احمد فاروقی کے تاثرات درج ہیں اور سرورق کے اندرون تیج پر ڈاکٹر طارق قمر کی سند توثیق بھی شامل ہے۔ اس مجموعہ میں غزلیات سے پہلے کچھ اہم قلم کاروں کے تحریری تاثرات مضامین کی شکل میں موجود ہیں۔ یہ خالص غزلوں کا مجموعہ ہے جس کی ابتدا شاعر نے ”مناجات“ سے کی ہے۔ اس میں کل ۲۰۸ صفحات ہیں۔ اس کی قیمت ۲۵۰ روپیہ رکھی گئی ہے۔ اور یہ کتاب ”نجر الدین علی احمد میہو ریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

”آئینہ احساس کا“ اس شعری مجموعہ کے خالق شائق مظفر پوری ہیں۔ اس مجموعہ میں غزلیں، نظمیں، اور معرا نظمیں بھی موجود ہیں اور کتاب کے آخر میں مختلف موضوعات سے متعلق قطعات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی ابتدا اردو کی قدیم روایت یعنی حمد

”آوارہ لئے“ یہ شعری مجموعہ پی۔ پی۔ سریواستو اردن کا ہے۔ اس میں کل ۳۹ غزلوں سے پہلے ڈاکٹر قمر رئیس کا ایک مضمون بھی ”رند کا انفرادی لہجہ اور شعری آہنگ“ کے نام سے اس مجموعہ میں شامل ہے اور یہ مضمون ۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اس مجموعہ کی مکمل خوبیوں اور خامیوں کا اکتشاف ہوتا ہے۔ پی۔ پی۔ سریواستو رند کی شاعری سے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس کے مضمون کا یہ اقتباس بہت اہم ہے۔ ”شاعری میں الفاظ کے ہنرمندانہ استعمال کی روایت انھیں داغ اسکول کے استاد حضرت ساغر اجمیری سے ملی ہے۔ لیکن اس روایت یا ہنر کو انھوں نے اپنی اختراع صلاحیت سے نئی توجیح دی ہے۔ عصر حاضر کی بدلتی حسیت اور باطنی سوز و گداز کی ترجمانی کے لئے اس کی ضرورت بھی تھی۔ ورنہ ان کا کام روایتی قالب میں ہی ڈھلا ہوا ملتا۔“ جیسا کہ اس بھی شاعر کی شاعری میں اس وقت تک کی بنیاد کڑی اردو کی شاعری روایت سے تجربات شامل نہ کئے گئے ہوں اپنے عصری کے اس مجموعہ میں شامل غزلیں اپنی تمام تر نیا پن لئے ہوئے ہے، جس کی وجہ سے ان کے عناصر سے خالی نہیں ہوتے۔ ان کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ لیکن ان تمام ترسیل کے المیہ کے شکار ہو گئے ہیں۔ اس ضروری نہیں سمجھتا۔



بات کا تذکرہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ کہ کسی دوامیت حاصل نہیں ہوتی جب تک کی اس جڑی ہونے کے ساتھ اس میں نت نئے تقاضوں کی بنیاد پر۔ پی۔ پی۔ سریواستو رند روایت پسندیوں کے باوجود اپنے اندر ایک کے اشعار کیمت و کیفیت کے جذب و قبول غزلوں میں انسانی و اخلاقی اقدار کی بہترین ترخیوں کے باوجود ان کے بعض اشعار کی ایک خاص وجہ ہے جس کو یہاں بیان کرنا

پی۔ پی۔ سریواستو رند شاعری کے میدان کے پرانے شہسوار ہیں لہذا وہ ان باریکیوں کو دوسروں سے کہیں زیادہ خود محسوس کر سکتے ہیں۔ ”آوارہ لئے“ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے ان کے آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) ریگ زار (۲) رگ سنگ (۳) گل رنگ (۴) شہر احساس (۵) شجر شجر چھاؤں (۶) آسمان کے بغیر (۷) طنائیں دھوپ کی (۸) جاگتی تنہائیاں، اور ان کے تنقیدی مضامین کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ صوری اعتبار سے بھی دیدہ زیب ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین کا، کام مودود علی صدیقی نے انجام دیا ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰۰۷ء میں ہوئی ہے اور اس کتاب کی قیمت ۱۰۰ روپیہ درج ہے۔

”نئی زمین“ یہ مجموعہ غزلیات، عمران راقم کا ہے اس مجموعہ کی فہرست سازی ایک نئے عنوان ”قرینہ نئی زمین“ کے نام سے کی گئی ہے۔ اس مجموعہ میں ”نئی آواز سے نئی زمین تک“ کے عنوان سے عمران راقم کا ایک تفصیلی مضمون بھی شامل ہے۔ اس مجموعہ میں ۹۱ غزلیں

خالق کون و مکاں اور نعت سرور کونین صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ خاص کر اس مجموعہ میں ”عکس احساس“ کے نام سے ڈیڑھ صفحہ کا ایک تعارف نامہ بھی موجود ہے جس میں شائق مظفر پوری نے اس کتاب پر اپنے تاثرات تحریر کرنے

نیا دور جول ۲۰۱۸ء

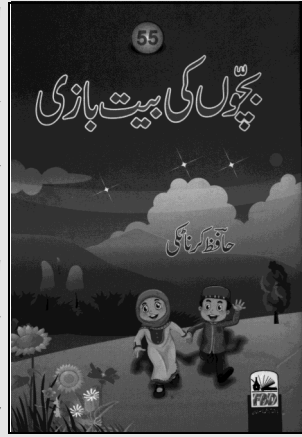
”دل کی دلیلیز پر“ اس شعری مجموعہ کے خالق کا نام ہدایت اللہ شمسی ہے۔ یہ مجموعہ اپنی کیفیت و کیفیت کے اعتبار سے انتہائی دیدہ زیب ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ذریعہ شعری مجموعوں میں، ادبا و نقاد اور دانشواروں سے لکھوائی جانے والی تقاریر کا سلسلہ ابھی بدستور جاری ہے۔ ایک دو مجموعے کو

ہے۔ لیکن اس میں ایک باب متفرقات کے نام سے بھی شامل ہے جس میں نعت کے علاوہ شخصی نظمیں بھی مختلف عناوین کے تحت شامل کی گئی ہیں۔ اس مجموعہ کا آخری حصہ میں قطعات کو رکھا گیا ہے۔ اسکی انفرادیت دیگر مجموعوں کی مناسبت الگ یوں ہے کہ اس میں آخر کے

یاد آتی صفحات کو ملا کر کل ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ”آنسو“ یہ شعری مجموعہ اسلم ملک کا ہے۔ اس مجموعہ کی سب اچھی بات یہ ہے کہ اس مجموعے کو ستائشی تقریظات سے پاک رکھا گیا ہے۔ تخلیق کار نے بقلم خود ۹ صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ لکھا ہے، جس میں انھوں نے اپنا تعارف

اور دیگر کوائف زندگی کے علاوہ اپنی شاعری سے متعلق بھی کچھ اہم معلومات اپنے قاری کے لئے فراہم کی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلم ملک بنیادی طور سے نظم کے شاعر ہیں۔ کچھ غزلیں بھی ہیں لیکن وہ نا کے برابر ہیں۔ انھوں نے نظمیں مختلف عنوان کے تحت لکھیں اور اس میں شخصی مرثیہ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ نعت کو بھی اپنے رزق سخن کی برکت کے لئے اس مجموعہ میں شامل کیا ہے۔ یہ مجموعہ

’بچوں کی بیت بازی‘ کے مصنف حافظ کرناگی ہیں۔ یہ کتاب خاص کر بچوں کی ذہنی نشوونما اور ان کی ذہن سازی کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس بات کے اعتراف میں ہمیں قطعی تکلف نہیں کہ موجودہ عہد میں اطفال ادب کے نام پر بہت کم لکھا جا رہا ہے، یا جو لوگ لکھ رہے ہیں۔ ان کی ستائش اور پذیرائی بھی اس طریقے سے نہیں ہو رہی ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ اس لئے کوئی بھی تخلیق کار اس وقت بچوں کے ادب کو تخلیق نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ بچوں کے نفسیات سے واقف نہ ہو۔ شاید انھیں وجوہات کی وجہ سے تخلیق کار اس میدان میں خامہ فرسائی کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن حافظ کرناگی جیسے تخلیق کار اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ اردو کا مستقبل انھیں بچوں کی تربیت اور ان کے ادبی ذوق کی آبیاری پر منحصر ہے اگر انھیں نذر انداز کیا گیا تو ہماری زبان ہو جائے گی۔



حافظ کرناگی نے خاص طور سے اس بچوں کے لئے ہونے والے بیت بازی کو سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں حافظ کرناگی ہیں، جو بچوں کو جلد ذہن نشین ہو جائیں اور قباحت نہ ہو، اور اس میں اردو کے حروف گئے ہیں یعنی ’الف سے ’ی‘ تک۔

کتاب کو مدرسوں، اسکولوں اور کالجوں میں بنیاد بنا کر تخریر کی ہے۔ اس کتاب کی سب نے ایسے سادہ اور سلیس اشعار تخریر کئے ان کی ادائیگی میں بچوں کو کسی طرح کی مقطعات کے حساب سے اشعار تخلیق کئے کافی کام کیا ہے۔ انھوں نے بچوں سے متعلق تقریباً ۳۵ مختلف عنوان سے تخلیق و ترتیب کی ہیں۔ ”معصوم ترانے“، ”مہکتی کلیاں“، ”بلبلوں کے گیت“، ”مزمنے“ چمکتے ستارے“، ”گلشن گلشن شبنم شبنم“، ”چاند گہن“، ”طفلسان“، ”ہندوستان (قومی گیت)“ وغیرہ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے ذریعہ اردو پڑھنے لکھنے اور بولنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے اندر موجود ادبی شعور کو بیدار کرنے میں بھی ایک اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ چونکہ بچوں کی ذہن سازی کا کام اگر بچپن سے ہی کیا جائے تو آگے چل کر اس سے نہ صرف اردو زبان کا فائدہ ہوگا بلکہ ہمارے ادب کو بھی غیر یقینی فائدہ حاصل ہوگا۔ یہ کتاب ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس کتاب کے آخر میں مصنف کی دیگر تخلیق کا نام بھی درج کیا گیا ہے۔

۸ صفحات ”یادداشت“ کے عنوان سے مختص ہیں۔ اس لئے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے قارئین اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات کو قلم بند کر سکیں۔ یہ طریقہ کار کافی بھلا معلوم دیتا ہے۔ یہ مجموعہ اپنی طبعیت اور جملہ تلازمات کی مناسبت سے قابل دید ہے۔ یہ مجموعہ

اکثریت ترقی پسند تحریک کی قائم کی ہوئی اس روایت کو ابھی بھی قابل اعتنا گردانتے ہیں۔ بہر حال اسے تخلیق کار کی اپنی ذاتی پسند و ناپسند پر محمول کرنا چاہئے۔

مذکورہ مجموعہ کی ابتدا میں تقاریر کا ایک طولانی سلسلہ ہے۔ یہ شعری مجموعہ مکمل غزلیات پر ہی مشتمل

۲۴۰ صفحات ہر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب و تدوین کا کام خود تخلیق کار نے کیا ہے۔ اس کی اشاعت دسمبر ۲۰۰۶ء میں عمل پذیر ہوئی۔ اس مجموعہ میں قیمت درج نہیں ہے۔

(مبصر: شاہد کمال)

آپ کے خطوط

آپ کو ادارت کا ایک سال بہت بہت مبارک ہو۔ آپ نے اس ایک سال میں نیا دور خوب سے خوب تر بنادیا۔

میرا افسانہ ادھورے خواب شایع کرنے کے لیے بہت بہت شکریہ۔

یہ کیا محترم ہم نے سوچا تھا ہمارا بھی مختصر تعارف شایع ہوگا لیکن مایوسی ہوئی۔ ادارہ یہ پڑھا تو آپ کا درد معلوم ہوا۔ بھائی ہر اچھے کام کے لیے پریشانیوں جھیلنی پڑتی ہیں۔ ان کی وجہ سے اچھا کام بند نہیں ہونا چاہیے یہ میری ناقص رائے ہے۔ اگر آپ یہ طے کر لیں کہ بنا تعارف کے تخلیق شایع نہیں ہوگی تو ممکن ہے آپ کی کچھ پریشانی کم ہو جائے۔ اچھا سلسلہ ہے ختم مت کیجئے۔

اگر یہ سلسلہ دوبارہ شروع کریں تو میا کے شمارے کے مصنفین کا تعارف ضرور شایع کریں۔

محمد قمر سلیم

مکملہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش کا مذکورہ ماہنامہ نیا دور اپنے آپ میں ایک سرکاری سوبینئر ہے جو عوام کے لئے رفائی و فلاحی اعتبار سے اپنی گونا گوں پالیسیوں کے تحت بحسن و خوبی خدمت انجام دے رہا ہے لیکن ثقافتی لحاظ سے ماہنامہ اردو ادب کا ایک مہر منور کا مصداق بھی ہے۔ اس کے عام شماروں کی بہ نسبت خصوصی شماروں کا اشاریہ یہاں تحریر کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ منجملہ تمام خصوصیات کے پیش نظر آنجناب کی بحیثیت مدیر کے شرکت اس کے حلقہ ادارت میں کر شائق امر ہے۔

مکنا لوجی کے اس تیز رفتار زمانہ میں اردو کے قارئین کی دلچسپیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس ماہنامے کو انفرادی طور سے جو Look دیا ہے وہ آپ کی صحافتی

بصارت کو اجاگر کرتا ہے۔ آپ کی اس پیشرفت کی گونج یقیناً اردو بستیوں کے حلقہ ادب میں تا دیر سنائی دے گی۔ نئے تخلیق کاروں کی ادبی کاوشوں کو اشاعتی موقع فراہم کرانے میں ان کی شناخت کی پیش قدمی کو لائق تحسین تصور کیا۔ اس اقدام کیلئے مبارکباد قبول فرمائیں۔

بسم اللہ عدیم برہان پوری

(برہان پور، ایم پی)

نیا دور کا بے حد جاذب شمارہ نظر نواز ہوا۔ کوریج کے ساتھ ساتھ اندر کے صفحات بھی قاری کو متاثر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ آپ کی ادارت میں رسالے کا معیار کافی اچھا ہوا ہے بلکہ مضامین کے لحاظ سے بھی جوئی تبدیلی لائی گئی ہے وہ رسالے کے معیار کی غماز ہے۔ بشیر بدر اور ندا فاضلی پر مشتمل فروری کا شمارہ بیحد معلوماتی، دلچسپ اور تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مالتی جوشی نے ندا فاضلی اور راحت بدر نے بشیر بدر کی زندگی پر خوبصورت انداز میں بھرپور روشنی ڈالی ہے جب کہ دیگر مضامین بھی قابل تعریف اور معلوماتی ہیں۔ شمارے کے مشمولات میں زیبا محمود صاحبہ کا مضمون 'ندا فاضلی کی شعری کائنات اور اس کے مخصوص معنوی تلازمات و تعلیقات' غالباً ۲۰۱۳ء میں امراتوں، مہاراشٹر کے رسالہ 'اردو' کے ندا فاضلی نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ دوبارہ اس کی اشاعت نیا دور میں دیکھ کر حیرت ہوئی اور مضمون نگار کی حرکت پر افسوس بھی۔ عام قاری کی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر مضامین کی اشاعت قابل تعریف ہے مگر غیر مطبوعہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی تعداد میں اضافہ کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر تنویر آزاد

گڑی اسٹریٹ، ظہیر آباد، ننگر پیٹی (ٹی ایس)

مئی ۲۰۱۸ء کا شمارہ موصول ہوا۔ آپ کی ادارت کو ایک سال مکمل ہو گیا۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ نے اس ایک سال کی قلیل سی مدت میں رسالے کے معیار میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

گزشتہ کے شماروں مضامین کی بہتات ہوتی تھی۔ آپ نے انہیں ختم کر کے بلکہ ان پر لگام لگاتے ہوئے معیاری اور ضروری مضامین کی اشاعت کو ترجیح دی اور دیگر بہت سے ایسے کالم شروع کئے جو نیا دور کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ تھے۔ بازید، ہندوستانی ادب، غیر ملکی ادب، ہندی کہانی، طنز و مزاح وغیرہ جیسے کالم کافی اہمیت کے حامل ہیں اور مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

آپ نے قلم کاروں کو بقول آپ کے اسٹار ٹریٹمنٹ سے بھی نوازا جس کے لئے آپ تعریف کے حقدار ہیں۔ اردو کے رسالوں میں اس طرح کا سلسلہ پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ یہ کافی بہتر تھا مگر افسوس کہ ناقدری کی بنا پر اسے بند کر دینا پڑا۔ اس سے سب سے زیادہ فائدہ ان قلم کاروں کو پہنچتا تھا جو اس میدان میں نئے نئے خاص کر یونیورسٹی کے طلباء وغیرہ اور نئے افسانہ نگار وغیرہ۔

مئی کے شمارے میں سلام بن رزاق کا افسانہ بہترین ہے۔ اور جے ایم سالی کی کہانی عکس بھی بہترین ہے۔ اس کے علاوہ بھی سارے افسانے مطالعہ کے لائق ہیں۔ اردو ادب میں کلڈ نائک کی روایت پر داؤد احمد نے کافی محنت کی ہے مگر کچھ تفنگی سی رہ جاتی ہے۔ اس میں مزید تحقیق کی ضرورت درکار ہے۔ آغا حشر کاشمیری کی ہمہ جہت شخصیت پر مضمون پڑھ کر دلی تسلی ہوئی۔ گزشتہ لکھنؤ کے تحت مرزا جعفر حسین کا تو جواب ہی نہیں۔ امید ہے یہ رسالہ اسی طرح ترقی کی راہیں طے کرتا رہے گا۔

راجہ تقویٰ

(درگاہ روڈ، لکھنؤ)



اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی گورکھپور میں عوام کے مسائل سنتے ہوئے (۱۳ مئی ۲۰۱۸ء)



وزیر ریاست برائے اطلاعات جناب نیل کٹھ تیاری لوک بھون، لکھنؤ میں شمع روشن کر کے سوشل میڈیا ورکشاپ کا افتتاح کرتے ہوئے، ساتھ میں ہیں، پرنسپل سکریٹری اطلاعات جناب ایش اسٹھی اور ڈائریکٹر اطلاعات ڈاکٹر اجول کمار (۱۱ جون ۲۰۱۸ء)



ڈائریکٹر اطلاعات ڈاکٹر اجول کمار لوک بھون آڈیٹوریم، لکھنؤ میں منعقد سوشل میڈیا ورکشاپ پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے (۱۲ جون ۲۰۱۸ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं० 146,
लखनऊ — 226 001



نائب صدر جمہوریہ ہند جناب وینکیا نائیڈو لکھنؤ میں جناب لال جی ٹنڈن کی کتاب (انہما لکھنؤ) کی رسم اجراء کے پروگرام کا
شع جلا کر آغاز کرتے ہوئے۔ ساتھ میں ہیں اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیگ، وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی اور نائب وزیر اعلیٰ ڈاکٹر دیش شرم (۲۶ مئی ۲۰۱۸ء)



نائب صدر جمہوریہ ہند جناب وینکیا نائیڈو لکھنؤ میں واقع اتر پردیش بجلی تعمیر کارپوریشن لمیٹیڈ کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر
ساتھ میں ہیں اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیگ اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی (۲۶ مئی ۲۰۱۸ء)

वर्ष : 73 अंक 02
जून 2018
मूल्य : 15 रु./—
वार्षिक मूल्य : 165 रु./—

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल० डब्लू/एन० पी०/101/2006-08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, डॉ० उज्ज्वल कुमार, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ-226001 से प्रकाशित-सम्पादक, सुहेल वहीद

نیا دور کے شمارے اب Wheeler A.H. کے شمارے اب دستیاب ہیں

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in